کچھ کلیسا کو بھی دیکھا دیر کی بھی سیر کی
جب حرم کا مل گیا رستہ تو اس پر جم رہا
(اسد ملتانی)

قائدِ اعظمؒ کا مذہب اور عقیدہ

ان کے اپنے قول و کردار کی روشنی میں

منشی عبدالرحمن خان

کتاب دارالذہن * ملتان سٹی

سلسلہ تصنیف و تالیف ۸۲

اشاعت اول ________ اپریل ۱۹۸۶ء

طابع ________ آر۔ آر پرنٹرز لاہور

ناشر ________ کاروانِ ادب۔ ملتان صدر۔

تعداد ________ ۱۱۰۰۔ گیارہ سو

قیمت ________ ۴۰/- روپے

اِنتساب

ان کے نام :

- جو قائدِ اعظم کو شیعہ تصوّر کرتے ہیں ۔
- جو قائدِ اعظم کو فاسق ۔ فاجر اور کافرِ اعظم کہتے ہیں ۔
- جو کہتے ہیں کہ قائدِ اعظم نے اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے پاکستان کا مطالبہ نہ کیا تھا ۔

مُنشی عبدالرحمان خان

اعلانِ قائدِ اعظمؒ

انگلستان سے واپسی پر مولانا ظفر علی خاں اور سردار عبدالرّب نشترؔ کی موجودگی میں قائدِ اعظم نے بیان دیتے ہوئے فرمایا :۔

”میں لندن میں امیرانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب میں اسے چھوڑ کر انڈیا اس لئے آیا ہوں کہ یہاں لا الٰہ الا اللہ کی مملکت یعنی پاکستان کے قیام کے لئے کوشش کروں۔ اگر لا الٰہ الا اللہ پر مبنی حکومت قائم ہو جائے تو افغانستان۔ ایران۔ ترکی۔ اُردن۔ بحرین۔ کویت۔ حجاز۔ عراق۔ فلسطین۔ شام۔ ٹیونس۔ مراکش۔ الجزائر اور مصر کے ساتھ مل کر یہ کتنا عظیم الشان بلاک بن سکتا ہے۔“

(ماہنامہ منارہ کراچی)

(روزنامہ ندائے ملّت۔ لاہور)

تاریخی بے انصافی

قائدِ اعظمؒ کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی یہ ہوتی چلی آ رہی ہے کہ ان پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی آپ کو مومنانہ صفات، مذہبی جذبات، دینی تاثرات، اسلامی رجحانات کے آئینہ میں پیش نہیں کیا۔ جیسے دین و مذہب سے آپ کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو حالانکہ آپ کا ہر ارشاد، ہر بیان، ہر تقریر اسلام کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھی۔ گو آپ منافقین کی طرح اسلام اسلام کی رٹ نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ اٹھتے بیٹھتے اسلام ہی کو اپنے مخصوص رنگ اور عصری تقاضوں کے مطابق پیش کرتے تھے۔ اگر آپ کی ہر تقریر اور ارشاد کا دیانتدارانہ جائزہ لیا جائے تو وہ اسلام کی کسوٹی پر پورا اترے گا۔

قائدِ اعظمؒ اگرچہ ابتداً آغا خانی، پھر اثنا عشری شیعہ رہے مگر بعد ازاں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تعلقات استوار ہونے پر شیعیت کو بھی خیرباد کہہ دیا اور فرقہ پرستی کی حدود سے آزاد ہو کر ایک صحیح مسلمان کی حیثیت اختیار کر لی۔

(مولانا رئیس احمد جعفری)

فہرس

اللہ اکبر
اللہ سب سے بڑا ہے

دیباچہ

حقیقتِ حال

میرے شعور نے پیروں کی دنیا یعنی ملتان میں آنکھ کھولی اور پیروں کے ہی اسلامیہ ہائی سکول میں کچھ تعلیم حاصل کی۔ جس کے دوران ۱۹۲۶ء میں ایک کتاب میں مرشد کی شناخت کی چالیس نشانیاں درج پائیں جن میں پہلی نشانی یہ تھی کہ :-

"اس کا ہر قول و فعل خدا کے لئے ہو۔ اپنے لئے نہ ہو"

اس دن سے میں نے ایسے مرشد کی تلاش شروع کر دی مگر ؎

خدا مل جاتے یہ ممکن ہے فطرت
مگر ملتے نہیں بندے خدا کے

اس میں چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ ہمت میں نے بھی نہ ہاری۔ بمصداق جوئندہ یابندہ ستّرہ سال بعد حق تعالیٰ نے ایک ایسے "مردِ غازی" سے رابطہ قائم کرا دیا جو بظاہر تاجر اور آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے مگر بباطن ابدال تھے اور انہیں دربارِ بغداد سے قائدِ اعظم کی روحانی اصلاح و تربیت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ جہاں قائدِ اعظم کے مورثِ اعلیٰ پیر سید عبدالرزاق شاہ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ ایک زمانہ میں غازی صاحب کا وہاں سونے کا کاروبار تھا۔ اس زمانہ میں ان کا ۴۸ لاکھ روپے کا بینک بیلنس تھا۔ سواری کے لئے رولز رائس موٹر رکھی ہوئی تھی۔ جب دربارِ جیلان سے اس روحانی منصب پر فائز ہوئے تو سب کچھ تقسیم کر کے امرتسر آ گئے اور تقسیمِ ہند کے بعد لاہور منتقل ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔ اربابِ مسلم لیگ انہیں اصل نام سے جانتے تھے اور ہم انہیں اُن کے مقام سے

پہچانتے تھے۔ کیونکہ راقم الحروف بھی ۱۹۴۲ء سے ان کے زیرِ تربیت آ گیا تھا غازی ان کا لقب تھا اور اسی سے ہم ان کا ذکرِ خیر بشرطِ ضرورت کرتے تھے مگر ہمیں اس بات کی سخت ممانعت تھی کہ ہم ان کے نام اور روحانی مقام کا کہیں انکشاف نہ کریں۔ اسی لئے ان کا جو تذکرہ راقم کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ اس میں ان کا اصل نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس کی بجائے ان کے لقب غازی سے کام لیا گیا۔ ان کے مکتوبات بھی غازی صاحب کے نام سے انکی حسبِ اجازت ۱۹۷۳ء میں "اندازِ سخن" میں شائع ہوئے۔

یہ صاحب، اتنے صاحبِ فراست تھے کہ آنے والے واقعات کی دس دس سال قبل اس طرح اپنی مجلس یا خطوط میں پیش گوئی کرتے تھے۔ جیسے وہ ان واقعات کے عینی شاہد ہوں۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء کے خطوط میں دوسری جنگِ عظیم کے اور ۱۹۴۶ء کے خطوط میں پاکستان کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا۔ وہ دس دس سال بعد ہم نے بچشم خود پورا ہوتے دیکھا۔ جس پر آپ کے خطوط جو "مشاہدات و واردات" اور "اندازِ سخن" میں شائع ہوئے۔ شاہدِ عدل ہیں۔

یہ قائدِ اعظم کے بہت بڑے معتمد اور مقرب تھے اور اربابِ مسلم لیگ بسا اوقات انہی کی معرفت اپنی بات قائدِ اعظم سے منوایا کرتے تھے۔ معروف مشاہیرِ اسلام سے ان کی شناسائی تھی۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے یہ بڑے منظورِ نظر تھے اور علمائے اشرفیہ کے بڑے مداح اور معتقد! غازی صاحب جب بھی ضرورت سمجھتے وہ قائدِ اعظم سے صرف اپنے تاثرات بیان کر دیتے اور وہ جس طرح مناسب و موزوں سمجھتے اس پر عمل کرتے مثلاً سر فیروز خان نون جب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے استعفیٰ دے کر سیدھے قائدِ اعظم کی قیامگاہ پر کوٹھہ پہنچے تو انہوں نے اپنا وزٹنگ کارڈ اندر بھیجا۔ غازی صاحب بھی اس وقت وہیں موجود تھے انہوں نے قائدِ اعظم سے صرف اتنا کہا کہ:-

"قائدِ اعظم! یہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے آ رہے ہیں۔"

قائدِ اعظم ان کا مطلب سمجھ گئے اور فیروز خان نون سے اس وقت ملنے کی بجائے دوسرے دن ملاقات کا وقت دیا۔

جہادِ کشمیر کا آغاز بھی غازی صاحب کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے لیاقت علی خان

سے کہا کہ آپ ہمیں ایک بمبار جہاز دیدیں، جو سری نگر کے ہوائی اڈے کو تباہ کر آتے۔ تاکہ ہندوستان کی فوجیں وہاں نہ اُتر سکیں اور پائلٹ کو ہم آزاد علاقہ میں چھپا دیں گے، مگر لیاقت علی خان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد غازی صاحب نے اپنے رفقاء کے مشورہ سے محاذِ کشمیر کا کنٹرول لیاقت علی خان کے سپرد کر دیا۔

قائدِ اعظم میں جو بلا کی سیاسی فراست و بصیرت تھی اور جس کے ذریعے انہوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کو نیچا دکھایا۔ وہ سب ان کی نظر کا فیضان تھا۔ انہوں نے ہی راقم کا مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی سے ان الفاظ میں تعارف کرایا۔

"حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اس صدی کے مجدد تھے۔ بس اس سے زیادہ کیا لکھوں .... حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابیں پڑھا کریں جو ایمان تازہ کرنے والی ہوتی ہیں"۔

ان ہی کی زبانی مجھے قائدِ اعظم کے ایسے حالات معلوم ہوتے رہے۔ جن تک دوسروں کی رسائی ممکن نہ تھی۔ اس مردِ غازی کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوا کہ قائدِ اعظم کی دینی تربیت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمائی تھی۔ قائدِ اعظم کو شیعیت کی دلدل سے بھی انہوں نے نکالا تھا۔ گاہے گاہے وہ اپنے خطوط میں بھی اس امر پر روشنی ڈالتے تھے کہ قائدِ اعظم شیعیت سے کتنے متنفر تھے۔ وہ اپنے خط مورخہ ۷، فروری ۱۹۷۷ء میں لکھتے ہیں،

"کوئٹہ میں یوم حسین پر شیعہ حضرات قائدِ اعظم کو لینے کے لئے آئے تھے۔ آپ نے انکار فرمایا۔ فرمایا کہ مسلمانوں میں ایسی مجالس ہونی چاہئیں۔ جہاں تفرقہ نہ ہو اور آپ کے ہاں ایسی مجالس ہوتی ہیں۔ جن کو میں پسند نہیں کرتا۔ پرانی قربانیوں کا ذکر اچھا ہے لیکن اب فائدہ؟ قوم کو اب جو مشکلات ہیں۔ ان کا حل سوچنا چاہیئے اور یہ بات مسلمانوں کے اتفاق اور اتحاد میں ہے"۔

(اندازِ سخن صہ۹۸)

ل اندازِ سخن صہ۵ ایضاً، ۲ ،صہ۵۳ ایضاً

راقم الحروف نے جو بات قائدِ اعظم کے علم میں لانی ہوتی، غازی صاحب کو ہی کہتا اور ان ہی کے ذریعہ جواب حاصل کرتا۔ چنانچہ وہ اپنے خط مورخہ ۷ فروری ۱۹۴۷ء میں ہی لکھتے ہیں :-

"قائدِ اعظم جب لاہور تشریف لائیں گے تو انشاء اللہ ان کا بیان لینے کی کوشش کروں گا۔ دُعا فرمادیں کہ مولا کریم اس مرد سیاست دان سے کوئی ایسا کام کرا دے جس سے ہندوستان کے مسلمان سربلندی کی زندگی بسر کرسکیں" (اندازِ سخن صہ ۹۸)

اسی خط میں مزید یہ تحریر ہے :-

"قائدِ اعظمؒ جب تشریف لاویں گے تو انشاء اللہ حضرت قبلہ مولانا اشرف علیؒ کے خطوط اور ان کے جواب کے متعلق معلوم کروں گا" (ایضاً)

مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت غازی صاحب کی دینی اور روحانی تربیت نے قائدِ اعظمؒ کو عارف باللہ بنا دیا تھا۔ عارف کی تدفین ابدال کے ذمہ ہوتی ہے۔ جس وقت قائدِ اعظمؒ کی وفات ہوئی اس وقت غازی صاحب قائدِ اعظمؒ کے نمائندہ کی حیثیت سے دربارِ نبویؐ میں حاضری دینے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہے تھے۔ ان کا بحری جہاز اس وقت کراچی سے بارہ میل کے فاصلہ پر جا رہا تھا۔ غازی صاحب نے خبرِ وفات سنتے ہی جہاز کے کپتان کو اپنی نمائندگی کے کاغذات دکھلا کر کراچی واپس جانے کے لئے کہا مگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو غازی صاحب واپس اپنے کیبن میں چلے گئے۔ نیچے سے جہاز میں ایک ایسا نقص پڑ گیا کہ کپتان کو جہاز کراچی پورٹ پر واپس لانا پڑا۔ اس وقت شہر میں مکمل ہڑتال تھی کہ معاً ایک ملٹری ٹرک وہاں پہنچا۔ جس نے انہیں جنازہ گاہ تک پہنچایا۔ آگے ملٹری کا پہرہ تھا۔ اس نے انہیں تابوت قائدِ اعظم تک جانے سے روکا۔ سامنے خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر اور علامہ شبیر احمد عثمانی بیٹھے تھے۔ غازی صاحب کو دیکھتے ہی مولانا شبیر احمد عثمانی نے پہرہ داروں کو کہا کہ " ان کو آنے دو۔ ان کے اصلی وارث تو اب آئے ہیں" جس پر انہیں آگے جانے کی اجازت دیدی گئی۔ علامہ عثمانی

نے غازی صاحب سے فرمایا "لو بھائی اپنی امانت سنبھالو"

غازی صاحب نے طویل القامت قائداعظم کو اکیلے اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھا کر قبر میں اتارا۔ اور واپس جاکر محمدی جہاز سے مجھے لکھا کہ:۔

"خدا کا شکر ہے کندھا دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے قائدِ اعظم کو قبر میں اتارا ان کا وزن بمشکل پندرہ سیر ہوگا۔ جب میں نے سر کا بند کھولا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت میٹھی نیند سو رہا ہے۔ سکرات موت کے اثرات نہ تھے......

آج صبح نو بجے جدہ شریف پہنچ گیا۔ سلطان ابن سعود کی طرف سے استقبال ہوا.... الخ (اندازِ سخن ص۱۷۰)

بفضلہ تعالےٰ میرے سلسلہ اشرفیہ کے اکابرین شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی۔ محقق اسلام مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی۔ مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان۔ مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق جدید لکھنؤ۔ مولانا عبدالباری ندوی استاد فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی اور مولانا ظفر احمد عثمانی صدر شعبہ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی سے نیاز مندانہ تعلقات تھے۔ اس لئے میں نے ان سے بھی تدفین قائدِ اعظم کے متعلق معلومات[1] جمع کرنی شروع کر دیں۔

"سیرتِ اشرف" کی تالیف کے دوران یہ راز کھلا کہ پاکستان کا ابتدائی تخّیل علامہ اقبالؒ کا نہیں تھا بلکہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تھا۔ اس کی خبر جب اربابِ علم و ذوق کو ہوئی تو انہوں نے اصرار کیا کہ اس تاریخی راز کو سیرت کی اشاعت تک پردہ اخفا میں نہیں رہنا چاہئے۔ اسے الگ رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا جائے تاکہ ایک تاریخی غلط فہمی جلد دور ہو جائے۔ مگر حضرت تھانویؒ کے بعض خلفاء نے نہایت نیک نیتی کے ساتھ اس تقاضا کی مخالفت کی کہ اس انکشاف کی اشاعت سے علامہ اقبالؒ کے عقیدت مندوں کو روحانی صدمہ پہنچے گا۔

---

[1] ان سب حضرات کے خطوط "اندازِ سخن" مطبوعہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

چونکہ اس راز کا مزید اخفا ایک قسم کی تاریخی بد دیانتی تھی ۔ اس لئے سیرتِ اشرفیہ کے دوسرے باب "تخیلِ پاکستان علامہ اقبال کا نہیں مولانا اشرف علی تھانوی کا تھا" کو ماہ جون ۱۹۵۹ء میں رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا اور اس کی کاپیاں مغربی پاکستان کے قریباً تمام بڑے بڑے اخبارات اور اہل الرائے حضرات کو تنقید و تبصرہ کے لئے بھیجی گئیں ۔ بلکہ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یونائیٹڈ پریس کے مقامی نامہ نگار نے بھی اپنے صدر دفتر کی معرفت اخبارات کو یہ خبر بھیجی ۔ مگر اخبارات نے علامہ اقبال کی شخصیت کے رعب اور حلقۂ اقبال کی ناراضی کے خوف سے اس اہم ترین تاریخی انکشاف کا مکمل "بلیک آوٹ" کیا اور اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی آخری ناکام کوشش کی ۔

اس کے کچھ عرصہ بعد راقم کی تصنیف "مشاہدات و واردات" شائع ہوئی ۔ جس میں قائدِ اعظمؒ کی دینی زندگی کے بعض گوشوں پر سے پہلی مرتبہ پردہ اٹھایا گیا تھا ۔ اربابِ نظر نے تو اُسے بنظرِ استحسان دیکھا ۔ مگر ملک کی بہت بڑی اسلامی جماعت کے نقیبوں نے اس کا مضحکہ اڑایا ۔ کیونکہ وہ انہیں سرے سے قائدِ اعظم ہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ اُن کے امیر، قائدِ اعظم کو صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں سمجھتے ۔ جیسا کہ وہ اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں لکھتے ہیں کہ :-

"لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو" (صفحہ ۴۵)

چنانچہ جہاں ہمارے منطقہ کے صاحبِ دل چیف جسٹس آنریبل ایس ۔ اے رحمان صاحب نے متعلقہ ابواب پڑھنے کے بعد مجھے یہ تحریر فرمایا کہ :-

"مشاہدات و واردات" کا کچھ حصہ دیکھا ہے، کچھ باقی ہے ۔ قائدِ اعظم کے متعلق جو واقعات آپ نے درج کئے ہیں، اُن سے کافی متاثر ہوا ۔ ایک عجیب قسم کی رقت کی کیفیت تادیر طاری رہی ۔ کتاب واقعی نہایت دلچسپ ہے "!

وہاں "جماعت اسلامی" کے نقیب "فاران" کراچی کے مدیر شہیر مولانا ماہر القادری صاحب نے یہ لکھا کہ:-

"اس انکشاف اور ریسرچ پر "مشاہدات و واردات" کے مصنّف کو کوئی بڑھیا قسم کا "پرائز" ملنا چاہیئے کہ قائدِ اعظم عارف باللہ بھی تھے ..... مسٹر محمد علی جناح مرحوم کے کچھ ایسے "دینی کارنامے" بھی ہیں جو ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں .... ان کی دینی تربیت حضرت مجدد الملّت مولانا اشرف علی تھانویؒ مختلف ذرائع سے فرماتے رہے "عجیب سے عجیب تر انکشاف اور نادر سے نادر تحقیق ...... قائدِ اعظم مرحوم کی زندگی میں اگر اُن سے اس قسم کی باتیں منسوب کی جاتیں تو وہ قہقہہ لگا کر کہتے کہ "خدا کے لئے مجھے وہی رہنے دو جو میں ہوں"

(فاران دسمبر ۱۹۵۵ء)۔

علاوہ ازیں بعض دوسرے ظاہر بینوں کی طرف سے بھی شکایتی خطوط پہنچے کہ آپ نے قائدِ اعظم کو عارف باللہ اور مومن لکھ کر کتاب کی اہمیّت گرا دی، ظلم کر دیا وغیرہ وغیرہ مگر کسی کو پیش کردہ واقعات کی حقائق کی روشنی میں تردید کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بلکہ وہی مقالہ اشاعت سے قبل جب مرحوم کے ایک ایسے مشہور اخبار کو شائع کرنے کے لئے بھیجا گیا جو قائدِ اعظم سے وابستگی کا سب سے زیادہ مدعی ہے تو اُس نے بھی اُسے شائع نہ کیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ شاید "اپنوں" کو بھی اس کی دینداری کا یقین نہ تھا اور غالباً اسی لئے قائدِ اعظم کے کسی سوانح نگار نے ان کی زندگی کے دینی اور روحانی پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی اور نہ ہی اُن کے کسی رفیقِ کار نے اُن کی دینی زندگی کا تفحص کیا۔ کیونکہ وہ تو بننے والی سلطنت میں اپنا مقام پیدا کرنے کی فکر میں ان کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ورنہ انہیں مرحوم کے گرد جمع ہونے سے اور کوئی غرض ہی نہ تھی۔ البتہ محترم اسد ملتانی نے اپنی ایک نظم میں جو میری کتاب "خضر و مسیحا" کے صفحہ ۲۲۲ پر شائع ہو چکی ہے۔ قائدِ اعظم کا نقشِ حیات پیش کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ قائدِ اعظمؒ نے ؎

کچھ کلیسا کو بھی دیکھا، دیر کی بھی سیر کی   جب حرم کا مل گیا رستہ تو اس پر جم رہا

مگر اس سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ انہیں حرم کا راستہ کس نے دکھلایا۔
دراصل ہر شخص کی زندگی کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ خانگی، مجلسی، سیاسی، علمی، ادبی وغیرہ علیٰ ہذا جس کو جس شعبۂ زندگی سے زیادہ تعلق اور واسطہ رہتا ہے۔ وہی اس کی تفصیل بتا سکتا ہے۔ دوسروں سے اس کی توقع محض عبث ہوتی ہے اور اگر کسی کی زندگی کا کوئی پہلو روشنی میں نہ لایا جائے تو اس سے اس کے عدم کا قیاس لازم نہیں آتا۔
جس طرح پاکستان کا تخیل سب سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ذہن میں آیا، اسی طرح قائدِ اعظم کی دینی تربیت کا خیال بھی سب سے پہلے انہیں کے دل میں پیدا ہوا۔ اور وہی اس سلسلہ میں کوشاں رہے۔ ایک تو اس وقت کے حالات اس امر کے متقاضی تھے کہ ان مساعی جمیلہ کو پردہ اخفا میں رکھا جائے۔ دوسرے حضرت تھانویؒ ہمارے رہنماؤں کی طرح پبلسٹی کے دلدادہ نہ تھے کہ وہ اپنی ہر کارگزاری کے متعلق کوئی "منادی" یا "روزنامچہ" یا بیانات شائع کرتے رہتے۔ تیسرے وہ ایسی خدمات کے اظہار کو داخل ریا سمجھتے تھے اور "نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال" کے اصول پر عمل پیرا رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے حضرت تھانویؒ کی تصنیفات میں ان کی تفصیلات درج نہیں تھیں۔ صرف اشاروں اور کنایوں سے کام لیا گیا تھا۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ قائدِ اعظم کی زندگی کے اس پہلو پر ذرا تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے تاکہ معترضین پر حقیقت واضح ہو جائے۔
چنانچہ راقم نے اس سلسلہ میں ان بزرگوں کی طرف رجوع کیا جو دربارِ اشرفیہ کیطرف سے اس خدمت پر مامور تھے۔ مگر انہوں نے راقم کی درخواست کا بالکل وہی جواب دیا، جو مزاج شناسِ رسولؐ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تدوین قرآن کی درخواست کرنے والوں کو دیا تھا کہ "جو کام خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کر گئے وہ میں کیسے کر سکتا ہوں"۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ کے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی جو ابتداً تین مرتبہ حضرت کے مرسلہ تبلیغی وفود کے ساتھ تھے اور بعد ازاں قائدِ اعظم کے گورنر جنرل بننے کے بعد ان کے پاس جاتے رہے۔ اپنے ایک گرامی نامہ میں راقم کو لکھتے ہیں کہ:-
"محمد علی جناح مرحوم کے ساتھ حضرت حکیم الامت کی جو مکاتبت ہوئی، وہ

سب خواجہ عزیز الحسنؒ (مصنف اشرف السوانح) کے توسط سے ہوئی۔
وہی حضرت کے مضامین کی انگریزی بناتے اور حضرت کے خط کے ہمراہ انگریزی
ترجمہ بھیجتے تھے تاکہ جناح صاحب کو مولانا کا خط سمجھنے میں آسانی ہو۔ اب
اگر اس کی اجازت حضرت کو پسند ہوتی تو خواجہ صاحب خود ہی کسی عنوان سے
اس کو سوانح میں درج کر دیتے۔ گو جناح صاحب کا نام ظاہر نہ کرتے یا خواجہ
صاحب بعد میں اس کو شائع کر دیتے۔ جب یہ کچھ نہیں ہوا۔ تو اب مجھے مناسب
معلوم نہیں ہوتا کہ اس کو شائع کیا جائے کہ یہ حضرت کی منشائے کے خلاف ہوگا"۔

اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔ حسنِ اتفاق سے جامعہ عربی خیر المدارس ملتان کے
ایک سالانہ جلسہ پر حضرت تھانویؒ کے بعض ارشد خلفاء جمع ہوئے۔ اُن کے روبرو اس مسئلہ کی
اہمیت پیش کی گئی اور رئیس الخلفاء دربارِ اشرفیہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب کی سفارش
پر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ان واقعات کی تفصیل خود لکھ دی جو ان کے ذاتی علم میں
تھے۔ زاں بعد حضرت کے برادر زادہ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کی خدمت میں راقم خود
حیدر آباد پہنچا جو بطور سفیر دربار اشرفیہ ہر تبلیغی وفد کے ساتھ قائدِ اعظم کے پاس جایا
کرتے تھے۔ اور بعد ازاں بہت مدّت اکیلے بھی جاتے رہے تھے اور جو اس سلسلہ میں
سب سے زیادہ معلومات رکھتے تھے۔ البتہ انہوں نے بڑی عرض و معروض کے بعد بعض
حالات کی تفصیل لکھ کر بھیجی اور بعض کے افشار پر وہ راضی نہ ہوئے اور تحریر فرمایا کہ:-

"زبردست صاحب ازاد مجدکم۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ آپ جب تشریف لائے تھے اور اپنا مقصد ظاہر
فرمایا تھا، تو میرا خیال ہو گیا تھا کہ اس مقصد کے لئے کچھ ضروری باتیں لکھنی چاہئیں
چنانچہ کل لکھنا شروع کیا۔ آج ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے
کہ اس تحریر سے اور ان واقعات سے آپ کا مقصد ضرور حاصل ہو جائے
گا۔ میں نے اگرچہ بہت مختصر لکھا ہے مگر انشاء اللہ آپ کے مقصد کے لئے
کافی ہو گا۔ جو مضمون ارسال ہے یہ آپ کی زبردستی ہی سے لکھا گیا ہے ورنہ مجھ

سے ممکن نہ تھا۔ والسلام۔ احقر شبیر علی"

اس کے بعد قائدِ اعظم کے یارِ غار نواب جمشید علی خان صاحب رئیس اعظم باغپت کی طرف رجوع کیا۔ جن کے اخلاص کی کشش قائدِ اعظم اور مس فاطمہ جناح کو میرٹھ کے ایک دور افتادہ قصبہ میں جانے اور وہاں ہفتوں ٹھہرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ہر ممکن اعانت فرما کر قائدِ اعظم کی دوستی کا حق ادا کیا اور نواب محمد اسماعیل خاں صاحب صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ۔ یوپی نے حضرت تھانویؒ کے خطوط روانہ کر کے مدد فرمائی۔
اس تگ و دو میں قائدِ اعظمؒ سے براہِ راست تعلق رکھنے والے ارباب علم وتقویٰ اور دیانت و امانت سے قائدِ اعظم کے مذہب و عقیدہ کے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہو سکیں۔ ان کی بنا پر میں نے ۱۹۵۶ء میں ایک اور کتاب "تعمیرِ پاکستان اور علمار ربانی" لکھ ڈالی جس کے ذریعہ قائدِ اعظم اور علمار ربانی کے باہمی روابط پر سے پردہ اٹھایا اور دنیا کو تبلایا کہ جسے وہ کافرِ اعظم سمجھتی ہے اسے راہِ راست پر کون اور کس طرح لایا۔ تاکہ اس کی غلط فہمی دور ہو۔ کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد میں نے اس کا پہلا نسخہ مولانا ماہرالقادری۔ مدیر فاران کو بھیجا۔ جنہوں نے نہ صرف میرا بلکہ قائدِ اعظم کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ جب ان پر حقیقتِ حال واضح ہوئی تو انہوں نے اپنی پہلی رائے سے رجوع کرتے ہوئے مذکورہ بالا کتاب پر یہ تبصرہ شائع کیا:۔

"قائدِ اعظم کے متعلق فاضل مصنّف کی ریسرچ قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے تو قائدِ اعظم کے ایمان و عرفان کے متعلق ایسی شہادت پیش کر دی ہے کہ جس کے ثقہ راویوں پر شبہ کرنا اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ یہ باتیں اس تفصیل سے پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اس کے راویوں میں دیوبند کے بلند پایہ علمار شامل ہیں۔ ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان راویوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھیں" (ماہنامہ فاران ستمبر ۱۹۵۶ء)

اس کتاب کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر حکومت پاکستان نے اسے دیگر تاریخی کتابوں کے ہمراہ تاریخی اثاثہ کے طور پر محفوظ کر لیا۔ جو اب تک بطور سند کام آرہی ہے۔ علاوہ ازیں

دنیا کے عظیم اکانومسٹ گنر مائر ڈال نے اپنی معروف کتاب "ایشین ڈرامہ" میں جو ہر برِّ عظیم میں الگ الگ کاپی رائٹ کے تحت کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوئی۔ اپنی اس کتاب کی جلد نمبر ا صفحہ ۳۰۷ پر میری اس کتاب یعنی تعمیر پاکستان اور علماء ربانی کو اپنے نظریہ کی تائید میں بطور سند پیش کیا ہے۔ جس کا فوٹو بھی "زبانِ خلق" کے صفحہ ۱۰۳ پر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔

صدر ایوب نے اپنے دورِ اقتدار میں اپنی دکان چمکانے کے لئے قائدِ اعظم کی تصاویر سرکاری و نیم سرکاری اداروں۔ دفتروں اور سٹیشنوں سے اتروا کر اپنی تصویریں لگوا دیں اور پاکستان کے تمام ذرائع ابلاغ انہیں پاکستان کا ناخدا ثابت کرنے میں لگے رہے۔ دوسری طرف نظامِ اسلام کا نعرہ لگانے والی اسلامی جماعت کے امیر نے تعمیر پاکستان کے عظیم کارناموں کو اپنے نامۂ اعمال میں شمار کرنا شروع کر دیا کہ پاکستان ہماری کوششوں سے معرضِ وجود میں آیا ہے اور یہ کہ قائدِ اعظم ان کے مخلصین و معتقدین صحیح مسلمان نہ تھے۔

اس محسن ناشناسی اور احسان فراموشی کے ساتھ ساتھ الٹا قائدِ اعظمؒ کو موردِ الزام ٹھہرایا جانے لگا کہ "انہوں نے خواہ مخواہ ہندوستان کو تقسیم کرا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے اور ایک اچھے ہمسائے اور دوست کی طرح ہمیں اکٹھے نہیں رہنے دیا گیا"۔ یہ آوازیں زیادہ تر افسر شاہی کے حلقوں سے سننے میں آئیں جو قائدِ اعظم کے تعمیر کردہ پاکستان میں ان اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ جن تک متحدہ ہندوستان میں ان کے لئے پہنچنا ناممکنات میں سے تھا بلکہ جن کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو آج ہندوستان میں ان مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ جن کی قربانیوں کے طفیل یہ لوگ آج یہاں برسرِ اقتدار ہیں۔ اب یہ خبریں اڑنے لگیں کہ:-

"قائدِ اعظمؒ نے اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے پاکستان کا مطالبہ نہ کیا تھا بلکہ وہ تو

مغربی جمہوری نظام یا
یورپی اقتصادی نظام یا
سوشلسٹ نظام

قائم کرنا چاہتے تھے"۔ جس پر کتاب ہذا لکھنے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ تاکہ پاکستان دشمن

عنصر کے گمراہ کن پروپاگنڈہ کی خود قائدِاعظم کے قول و کردار سے تردید کی جائے۔ علاوہ ازیں مختلف گوشوں سے اس امر کے تقاضے بھی شروع ہو گئے کہ :-

"آپ نے قائدِاعظمؒ کے مذہب اور اعتقاد کے بارے میں اپنی مختلف کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے۔ اسے یکجا کر کے ایک کتاب میں شائع کر دیا جائے۔ کیونکہ آپ کی بعض کتابیں نایاب ہیں جو دستیاب ہیں وہ ضخیم ہیں۔ جب تک موضوع زیرِ بحث پر سب کتابیں دستیاب اور زیرِ مطالعہ نہ ہوں طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ ایک ہی کتاب میں، موضوع زیرِ بحث کا اکٹھا مل جانا، قارئین کے لئے بڑی سہولت کا باعث ہوگا۔"

راقم الحروف نے قائدِاعظم کے مذہب و عقیدہ کے مختلف گوشوں پر اپنی مندرجہ ذیل کتابوں میں روشنی ڈالی تھی جو اسوقت قریباً کمیاب بلکہ نایاب ہیں :-

	کتاب	صفحات	مطبوعہ
۱	مشاہدات و واردات	۳۵۶ صفحات	مطبوعہ ۱۹۵۵ء
۲	تعمیرِ پاکستان و علماء ربانی	۳۲۸	″ ″ ۱۹۵۶ء
۳	سیرتِ اشرف (حضرت تھانویؒ)	۷۱۲	″ ″ ۱۹۵۶ء
۴	اندازِ سخن (مکاتیبِ مشاہیر)	۵۲۰	″ ″ ۱۹۷۲ء
۵	معمارانِ پاکستان	۲۷۴	″ ″ ۱۹۷۶ء
۶	کردارِ قائدِاعظمؒ	۵۲۰	″ ″ ۱۹۷۶ء

ان کے متعلقہ حصے حک و اضافہ اور ترتیب و تہذیب کے ساتھ اس کتاب میں یکجا کر دیئے ہیں تاکہ شائقین اور مخالفین پر قائدِاعظم کی دینداری، بے غرضی، بے نفسی، خلوص، صداقت، دیانت، امانت، ایمان و ایقان، عزم و توکل، ایثار و قربانی، حسنِ کردار معترضین اور متشککین پر واضح ہو جائے۔ افسوس کہ اس بے غرض انسان پر وہ حرف زنی کرتے ہیں۔ جو خود غرضی کے بندے ہیں ؎

مقتدا مذہب و ملت کے بنے ہیں وہ لوگ
واسطہ جن کو نہیں ملت و دیں سے کوئی

پھلیک - ملتان
۷ جنوری ۱۹۸۶ء

احقر العباد
منشی عبدالرحمٰن خان

فطری صلاحیتیں

ولادت باسعادت قائدِ اعظمؒ کے بزرگوں کا تعلق ملتان سے تھا۔ جو اس زمانہ میں سندھ کا دارالخلافہ تھا۔ اور یہاں اسماعیلیہ فرقہ کے داعی حضرت شمس سبزواری نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ایک مرتبہ قائدِ اعظم کے یارِ غار نواب جمشید علی خان آف باغپت ضلع میرٹھ نے خوش گپیوں کے دوران ان سے سوال کیا کہ آپ میں اتنی گھن گرج کہاں سے آئی ؟ تو قائدِ اعظم نے فرمایا :۔

"آپ کو پتہ نہیں کہ میں علاقہ ملتان کے ایک راجپوت خاندان سے ہوں ؟"

(ماہِ نو۔ ماہ دسمبر ۱۹۵۰ء قائدِ اعظم نمبر)

اس حقیقت کا ذکر قائدِ اعظم کے انگریز سوانح نگار مسٹر بولیتھو نے بھی اپنی کتاب JINAH میں بالفاظ ذیل کیا ہے :

"قائدِ اعظم کے کزن مسٹر محمد علی گانجانے بتایا کہ ہمارا خاندان صحرائے سندھ کے شمالی علاقہ ملتان سے کاٹھیاوار میں آیا تھا" (ص ۴)

قائدِ اعظم کے آباؤ اجداد ملتان سے کاٹھیاواڑ (گجرات) کی ریاست گوندل میں چلے گئے۔ جو اس ریاست کا صدر مقام اور سب سے بڑا شہر تھا۔ کچھ عرصہ بعد قائدِ اعظم کے والد ماجد جناح بھائی بغرض ترقیِ کاروبار کراچی تشریف لے گئے۔ جہاں ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو بروز اتوار جناح بھائی کے ہاں یہ لڑکا پیدا ہوا جو قائدِ اعظم مشہور ہوا۔ ان کی پیدائش کے بعد ان کے نام رکھنے کا مسئلہ پیش ہوا۔ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ :۔

"اب تک اس خاندان میں جو کاٹھیاواڑ رہتا تھا۔ بیشتر مردوں کے نام ہندو ناموں سے ملتے جلتے اور گجراتی زبان کے تھے۔ لیکن سندھ مسلمانوں کا علاقہ تھا اور ہمسایوں کے بچوں کے نام بھی اسلامی تھے۔ اس لئے ماں باپ نے اپنے بچے کا نام محمد علی رکھا تاکہ اس پر اللہ تعالےٰ کی رحمت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا سایہ رہے اور باپ کے نام کی نسبت سے آخر میں جناح کا لفظ جوڑ دیا گیا اور پورا نام محمد علی جناح پونجا قرار پایا۔"

(ہمارے قائدِ اعظم صہ۱۶)

یہ اسی نسبت کی برکت تھی۔ جس نے قائدِ اعظم کو بامِ عظمت تک پہنچایا اور ایک ایسی نوزائیدہ سلطنت کا حکمراں بنایا جو اس کی مخلصانہ اور بے غرضانہ جدوجہد سے معرضِ وجود میں آئی تھی اور جو اس وقت اسلام کی سب سے بڑی سلطنت تھی ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بچپن کے شوق

حق تعالیٰ نے جن سے کوئی بڑا کام لینا ہوتا ہے ان کی فطرت میں ہی ایسی صلاحیتیں رکھ دیتا ہے جو بچپن سے ہی اس کی عظمت کی غمازی کرتی ہیں۔ قائدِ اعظم بچپن سے ہی بڑے ذہین و فطین اور محنتی تھے۔ اخلاق بہت اچھا تھا۔ بڑے ہنس مکھ، اپنی باتوں سے اپنے ہم عصروں کو خوب ہنساتے۔ اچھے کپڑے پہنتے صاف ستھرے رہتے اور اچھی چیزیں کھانے کے شوقین تھے۔ تاریخی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھتے اور جو باتیں اچھی معلوم ہوتیں انہیں نوٹ کر لیتے۔ اپنے بزرگوں والدین اور بڑے بھائی بہنوں کا بڑا ادب کرتے تھے۔ پتنگ اڑانے کا بڑا شوق تھا۔

قائدِ اعظمؒ کے بچپن کے ایک دوست کا بیان ہے کہ "ایک دن ہم گلی کے لڑکے زمین پر گولیاں کھیل رہے تھے کہ محمد علی گھر سے نکلے۔ انہوں نے لڑکوں سے کہا۔
"تم لوگ گلی کی گندی مٹی اور نالیوں کے گندے پانی سے اپنے ہاتھ کیوں خراب

کرتے ہو؟ آؤ کوئی صاف ستھرا کھیل کھیلیں"۔
وہ اپنے گھر گئے اور گیند بلا لے آئے۔ پھر ہم سب قریب کے میدان میں گئے اور گیند بلا کھیلنے لگے۔ نہ جانے ان میں کیا بات تھی کہ گلی کے تمام لڑکے ان کی بات مانتے تھے"۔ (سیارہ ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۷۶ء)

ناصحانہ طبیعت قائدِاعظم نے بدو فطرت سے ہی ناصحانہ طبیعت پائی تھی۔ اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو اکثر اس امر کی تاکید کرتے رہتے تھے کہ:۔

"گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ وقت کی قدر کرو، اس کا ایک ایک پل دنیا کے تمام خزانوں سے قیمتی ہے، علم دولت کی کنجی ہے۔ انسان کو کسی سے نہیں گھبرانا چاہیئے۔ وہ ہمت کرے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرو۔ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ناامیدی بزدلی ہے۔ ہمیشہ سچ بولو۔ جس بات کو ٹھیک سمجھتے ہو اس کو ہانکے پکارے ڈنکے کی چوٹ کہو اور کسی کی ناراضگی سے مت گھبراؤ۔ بزرگوں کی عزت کیا کرو"۔

آپ کا روشن مستقبل تمام تر انہی بنیادوں پر تعمیر ہوا۔ ان باتوں کو مغرب زدہ طبقہ ناقابل عمل سمجھتا ہے۔ مگر اس با اصول رہنما نے دنیا کو ان پر عمل پیرا ہو کر دکھا دیا۔

جذبۂ سربلندی دس سال کی عمر میں آپ نے شہسواری سیکھی۔ آپ کو اسپ سواری کا بڑا شوق تھا، بفضلہٖ تعالیٰ آپ کے والد ماجد کے اصطبل میں کئی عمدہ گھوڑے اور بگھیاں موجود رہتی تھیں۔ اس لئے آپ روزانہ اپنے دوست کریم قاسم کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار ہو کر دور دور تک نکل جاتے تھے۔ جب ان کے گھوڑے سینہ تانے اور سر اٹھائے وقار و اعتماد کے ساتھ چلتے تو آپ اس سے بڑے محظوظ ہوتے، مضبوطی، سربلندی اور سرفرازی کا سبق آپ نے انہی سے سیکھا اور تب سے آپ نے یہ اصول بنا لیا کہ:۔

کرتے ہو؟ آؤ کوئی صاف ستھرا کھیل کھیلیں"۔
وہ اپنے گھر گئے اور گیند بلّا لے آئے۔ پھر ہم سب قریب کے میدان میں گئے اور گیند بلّا کھیلنے لگے۔ نہ جانے ان میں کیا بات تھی کہ گلی کے تمام لڑکے ان کی بات مانتے تھے"۔ (سیارہ ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۷۴ء)

ناصحانہ طبیعت قائدِ اعظم نے بد و فطرت سے ہی ناصحانہ طبیعت پائی تھی۔ اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو اکثر اس امر کی تاکید کرتے رہتے تھے کہ :-

"گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ وقت کی قدر کرو، اس کا ایک ایک پل دنیا کے تمام خزانوں سے قیمتی ہے، علم دولت کی کنجی ہے۔ انسان کو کسی سے نہیں گھبرانا چاہیئے۔ وہ ہمّت کرے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرو۔ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھو۔ نا امیدی بزدلی ہے۔ ہمیشہ سچ بولو۔ جس بات کو ٹھیک سمجھتے ہو اس کو ہانکے پکارے ڈنکے کی چوٹ کہو اور کسی کی ناراضگی سے مت گھبراؤ۔ بزرگوں کی عزّت کیا کرو"۔

آپ کا روشن مستقبل تمام تر انہی بنیادوں پر تعمیر ہوا۔ ان باتوں کو مغرب زدہ طبقہ ناقابلِ عمل سمجھتا ہے۔ مگر اس با اصول رہنما نے دنیا کو ان پر عمل پیرا ہو کر دکھا دیا۔

جذبۂ سربلندی دس سال کی عمر میں آپ نے شہسواری سیکھی۔ آپ کو اسپ سواری کا بڑا شوق تھا، بفضلہ تعالیٰ آپ کے والد ماجد کے اصطبل میں کئی عمدہ گھوڑے اور بگھیاں موجود رہتی تھیں۔ اس لئے آپ روزانہ اپنے دوست کریم قاسم کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار ہو کر دور دور تک نکل جاتے تھے۔ جب ان کے گھوڑے سینہ تانے اور سر اٹھائے وقار و اعتماد کے ساتھ چلتے تو آپ اس سے بڑے محظوظ ہوتے، مضبوطی، سربلندی اور سرفرازی کا سبق آپ نے انہی سے سیکھا اور تب سے آپ نے یہ اصول بنا لیا کہ :-

"ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھی جائے اور مشکلات کے سامنے جھکنے کی بجائے بڑی پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اور ان پر بڑی ہمت و قوت کے ساتھ قابو پانا چاہیئے۔"

یہی گھوڑے سواری بعدازاں رفیقۂ حیات کے انتخاب میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔

تعلیمی انہماک قائدِ اعظمؒ شروع سے محنت کے عادی تھے۔ اور بلند عزائم رکھتے تھے۔ آپ کی چچی کا کہنا ہے کہ:

"ایک دن میں رات کو کسی کام سے جاگی۔ رات آدھی سے بھی زیادہ گزر چکی تھی میں نے دیکھا تو محمد علی کے کمرہ میں بتی جل رہی ہے۔ جب میں نے اندر جا کر دیکھا تو محمد علی میز پر جھکا مطالعے میں مصروف تھا۔"

میں نے کہا۔ "محمد علی اگر اتنا پڑھو گے تو صحت خراب کر لو گے۔"

محمد علی نے جواب دیا۔ "چچی اگر میں محنت نہیں کروں گا تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا۔"

میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر کے جب محمد علی انگلستان جا رہے تھے تو تمام خاندان والے انہیں الوداع کہنے کے لئے بندرگاہ پر موجود تھے۔ ان کی جدائی کے خیال سے خواتین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اتنے میں محمد علی میرے پاس آیا اور کہنے لگا:

"چچی جان میں بڑا آدمی بننے جا رہا ہوں۔ آپ کو مجھے مسکرا کر رخصت کرنا چاہیئے"

(سیارہ ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۷۶ء صہ ۵۶)

یہ تھے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، جو آپ کے قلب سلیم اور عزم صمیم کی غمازی کر رہے تھے، محنت کی اسی عادت کی بدولت آپ زندگی میں ہر قدم پر کامیابی سے ہمکنار رہے۔

روانگی انگلستان آپ کو وکیلوں کا سیاہ چغہ بڑا پسند تھا۔ جس نے بچپن میں آپ کے دل میں بیرسٹر بننے کا شوق پیدا کر دیا اور اس شوق نے یہ اثر دکھایا کہ آپ کے والد کے ایک دوست فریڈرک کرافٹ نے انہیں مشورہ دیا کہ یہ لڑکا بڑا ذہین ہے اسے اعلیٰ تعلیم

کے لئے لندن بھیج دیا جائے۔ آپ کے والد نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ لڑکوں کو تعلیم کے لئے بیرونی ممالک میں بھیجنے سے قبل ان کی شادی کر دی جاتی تھی۔ تاکہ وہ وہاں کے جنسی اثرات قبول نہ کریں، انگلستان سے واپسی چونکہ جلد متوقع نہ تھی، بلکہ تکمیل تعلیم کے لئے دو تین سال معمولی بات تھی۔ آپ کی والدہ نے آپ کی شادی پر اصرار کیا۔ قریباً سولہ برس کی عمر میں چودہ سالہ ایمی سے آپ کی شادی کر دی گئی اور شادی کے کچھ عرصہ بعد ۱۶ سال کی عمر میں آپ انگلستان روانہ ہو گئے، لندن پہنچ کر آپ نے بالکل اجنبی ماحول پایا، سردی بھی وہاں بلا کی تھی۔ جس کے آپ عادی نہ تھے مگر آپ نے بہت جلد اپنے آپ کو وہاں کے غیر مانوس ماحول سے مانوس کر لیا۔ چونکہ وہاں زیادہ عرصہ قیام کرنا تھا اور ہوٹل کا کا خرچ زیادہ تھا۔ اس لئے آپ نے بڑی عقلمندی دکھائی اور بہت جلد اپنی رہائش کے لئے ۳۵۔ رسل روڈ کنگسٹن، جگہ حاصل کر لی۔

حبِّ رسولِ مقبولؐ قائداعظم کا آبائی تعلق کسی مذہبی خاندان سے نہ تھا، نہ ہی شروع میں آپ کو کوئی مذہبی تعلیم دی گئی تھی۔ مگر قدرت نے آپ کو شعور بالکل مذہبی یا دینی دیا تھا۔ کیونکہ آپ سے اسلام کی بہت بڑی خدمت لی جانی تھی اور اسی کے تقاضے کے تحت اس مقلب القلوب نے آپ کے دل میں اپنے رسولِ مقبولؐ کی غائبانہ محبت پیدا کر دی تھی۔ ورنہ لڑکپن میں ایسی باتوں کی طرف اکثر دھیان نہیں ہوتا۔ اس بات کا پتہ اس وقت چلا جب آپ اپنی تعلیم کے لئے کسی اچھی سی درس گاہ کی تلاش میں نکلے۔

اس زمانہ میں، لندن میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے چار بڑے ادارے تھے۔ یعنی مڈل ٹمپل، انر ٹمپل، گریز ان اور لنکنز ان۔ ان میں سے قائداعظم نے کسے اور کیوں منتخب کیا۔ اس کا اظہار آپ نے ۱۹۴۷ء میں کراچی بار کے ایک اجتماع میں بالفاظ ذیل کیا۔

> "ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسولِ اکرمؐ کی، جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین مدبروں میں ہوتا ہے۔ بہت عزت تھی، ایک دن اتفاقاً میں "لنکن ان" گیا اور میں نے اس کے دروازے پر پیغمبرِ اسلام کا اسم مبارک

کندہ دیکھا۔ میں نے "لنکن ان" میں داخلہ لے لیا۔ کیونکہ اس کے دروازے
پر آنحضرتؐ کا نامِ مبارک دنیا کے عظیم قانون سازوں میں سرِفہرست تھا"
(ہمارے قائدِ اعظم از اعجاز احمد صہ ۲۸)
یہ اسی انتخاب لاجواب کا نتیجہ تو تھا کہ آپ بھی بے مثال کردار کے حامل ہوئے۔

لاثانی قانون دان قائدِ اعظم کو بچپن سے ہی محنت شاقہ کی عادت تھی۔ اس لئے لندن میں بھی اپنی علمی، ادبی، مجلسی سرگرمیوں کے باوجود آپ نے اپنا بیرسٹری کا امتحان انتہائی محنت کی بدولت دو سال کے قلیل عرصہ میں پاس کرلیا۔ آپ پہلے ہندوستانی طالبعلم تھے جنہوں نے ۱۸ سال کی عمر میں بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ حُبِ سرکارِ دوجہاںؐ کی بدولت آپ کا شمار بھی دنیا کے عظیم قانون دانوں میں ہونے لگا اور آپ کی وکالت اور شہرت کا پوری دنیا میں ڈنکا بج گیا۔ وہ صرف عظیم قانون دان نہ تھا، وہ ایک عظیم انسان عظیم مسلمان اور عظیم سیاست دان بھی تھا۔

آپ کی ابتدائی زندگی کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ جہاں عام ہندوستانی مسلمان انگریز کے سامنے سرنگوں ہوکر آداب بجا لانے پر فخر کیا کرتے تھے۔ وہاں قائدِ اعظم اپنے طالب علمی کے زمانہ سے ہی ہندوستانیوں کو غلام بنانے والے انگریزوں کو دیکھتے ہی اکڑ جاتے تھے، ان سے ملتے وقت دوسروں کی طرح نہ آپ کے منہ سے خوشامدانہ، چاپلوسانہ کاسہ لیسانہ الفاظ نکلتے تھے اور نہ ان کے سامنے گردن جھکتی تھی اور پھر وکالت بھی اتنی ڈنکے کی چوٹ بجا کر کی تھی کہ ۴۲ - ۱۹۴۱ء میں وائسرائے ہند کے مشیر اصلاحات مسٹر ہڈسن پاک و ہند کی آزادی پر اپنی کتاب "تقسیم عظمیٰ" میں لکھتے ہیں کہ:

"جناح وہ شخص تھا جس نے ساری عمر کوئی سبکی برداشت نہیں کی، اسکی زندگی ایسی داستانوں سے بھری پڑی ہے کہ ادھر کسی کے منہ سے دانستہ یا غیر دانستہ کوئی خفیف بات نکلی، ادھر جناح نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ کوئی جج، کوئی گورنر جنرل، کوئی برطانوی وزیر، کوئی عالی نصب محترمہ جناح کے

تیغ صفت جوابی طنز سے کوئی مستثنٰے نہ تھا۔ وہ تجاہل کو تذلیل اور تغافل کو توہین سمجھتا تھا"

آپ دنیا کے پہلے اور آخری سیاست دان تھے جنہوں نے بلا تیغ و تفنگ محض اپنی خدا داد قانونی قابلیت اور تدبّر سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت حاصل کی اور ہندوؤں اور انگریزوں جیسی عظیم سامراجی طاقتوں کو نیچا دکھایا۔

قائدانہ دلچسپیاں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عشرت کدۂ یورپ میں جو بھی گیا وہاں کے سانچے میں ڈھل کے آیا یا وہاں کے بہت سے اثرات لیکر۔ ان سے بچ کر وہی آئے جنہوں نے وہاں کی آلودگیوں سے دامن پاک رکھا۔ قرآنی اور اسلامی تعلیمات کی بدولت محمد علی جوہر کی طرح محمد علی جناح بھی ایک بے داغ نوجوان نکلا، علاّمہ اقبال کی طرح آپ نے بھی وہاں کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، تجسّس کا مادہ تو آپ میں بچپن سے تھا۔ لندن کے زمانہ طالب علمی میں آپ نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا، انگریزوں کی خوبیوں اور خامیوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا، ان کی سماجی، سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور قومی زندگی کے ہر پہلو سے جائزہ لیا اور وہاں کے عام حالات، عادات اور اطوار اپنانے کی بجائے خود کو ان سے ہر طرح بچاکے رکھا۔ اپنے مشاہدات کی روشنی میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تعمیر سیرت بھی جاری رکھی اور اپنی زندگی کو وہاں کے اثرات سے محفوظ رکھ کر ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا۔

آپ اپنا فالتو وقت آوارگی کی بجائے برٹش میوزیم لائبریری میں مطالعہ کرنے یا دنیا کی مشہور جلسہ گاہ ہائیڈ پارک میں حکومت پر تنقیدیں سننے یا دارالعوام کے اجلاسوں کی کارروائی دیکھنے برطانوی مدبّروں اور مفکروں کی تقریریں سننے یا ان کی صحبت میں بیٹھنے میں گزارتے تھے اور اپنی زندگی کا کوئی لمحہ فضول یا غیر مفید باتوں میں ضائع نہ کرتے تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنے قیامِ لندن کے دوران جو علمی، بصری، سمعی تعلیم و تربیت پائی۔ وہی آپ کو اوجِ رفعت و عظمت پر پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔

آپ نے اپنے قیام لندن کے زمانہ طالب علمی میں وہاں کی آزاد فضا میں رہ کر

انتخابات لڑنے کی تربیت اور سیاسی شعور حاصل کرلیا کہ اپنی غلامانہ زندگی کا آزادانہ زندگی سے موازنہ کرتے ہوتے بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ:۔

"برٹش ایمپائر کا ہندوستان ہی وہ تنہا ممبر ہے جو حکومت کے نظام میں نمائندگی سے محروم ہے اور دنیا میں ہندوستان ہی وہ تنہا ملک ہے جہاں ذمہ دار حکومت کا وجود ہی نہیں" (لندن ٹائمز)

مجاہدانہ سرگرمیاں قائدِ اعظم کے قیام لندن کے زمانہ میں انگلستان میں لبرلزم یعنی جذبہ آزادی عروج پر تھا۔ آپ نے بھی لبرل ازم کے ممتاز رہنماؤں سے تعلق قائم کرلیا۔ ان سے متأثر ہوکر آپ نے بھی ان کے افکار و نظریات اپنالئے۔ یہی جذبہ آزادی بعد میں آپ کی رگ و پے میں سرایت کرگیا۔ اور اس کا اثر وہیں نظر آنے لگا۔ جس کے تحت آپ نے وہاں کے طلباء کے مسائل میں دلچسپی لینی شروع کردی اور ان کی تنظیم قائم کرنے میں بہت کوشاں رہے۔

حسنِ اتفاق سے، آپ کے اسی زمانۂ طالب علمی کے دوران، وہاں ایک ہندوستانی پارسی دادا بھائی نوروجی دارالعوام کی رکنیت کے لئے میدانِ انتخاب میں نکل کھڑے ہوتے انگریز یہ برداشت نہ کرسکے کہ ان کے غلام ملک کا باشندہ - ان کے آزاد ملک میں ان کے مقابلہ میں نکل کر انتخاب لڑے۔ اس لئے ملکہ وکٹوریہ کے وزیرِ اعظم لارڈ سالسبری نے، انگریزوں کو، ہندوستانیوں کے خلاف بھڑکانے اور نسلی منافرت پھیلانے کے لئے اپنی ایک انتخابی تقریر میں، ہندوستان کے اس مشہور سیاسی لیڈر دادا بھائی نوروجی کو " کالا آدمی " کہدیا۔ حالانکہ دادا بھائی نوروجی لارڈ سالسبری سے کم گورے نہ تھے۔

اس واقعہ نے یورپ میں مقیم ہندوستانیوں کو بالعموم اور انگلستان میں زیرِ تعلیم ہندوستانی طالب علموں میں بالخصوص اشتعال پیدا کردیا اور انہوں نے قائدِ اعظم کی زیرِ قیادت دادا بھائی نوروجی کو کامیاب کرانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ تاکہ ہندوستانیوں کی اس توہین کا بدلہ لیا جائے۔ اس مہم میں سی آر داس بھی قائدِ اعظم کے دست راست تھے اور ان

طالب علموں نے اپنی شبانہ روز سرگرمیوں سے دادا بھائی نوروجی کو کامیاب کراکر سالبری کے طعنہ کا خوب بدلہ لیا۔

اس انتخاب نے قائدِ اعظم کے دل میں غاصب انگریزوں کے خلاف نفرت کا ایسا بیج بویا جو تا زیست ارتقائی منزلیں طے کرتا رہا اور انگریزوں کو اپنے ملک سے نکال کے چھوڑا۔

صبر و تحمل

قائدِ اعظمؒ کو لندن گئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان کی اہلیہ ایمی بائی انتقال کر گئی۔ آپ کو جب اس کی وہاں اطلاع ملی تو آپ رنجیدہ خاطر ضرور ہوئے مگر اپنی تعلیم میں فرق نہ آنے دیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی انہیں لندن ہی میں والدہ کی فوتیدگی کی اطلاع ملی جس سے انہیں بہت محبت تھی اور جسے وہ آخری دنوں میں نہ دیکھ سکے اس صدمہ کو بھی انہوں نے بڑے صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ جب ان کو لندن میں بیوی اور والدہ کی فوتیدگی کی خبر ملی، اس وقت آپ کی عمر ۱۸ سال تھی۔ عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ وہ چاہتے تو لندن میں ہی بآسانی کسی کو اپنی رفیقہ حیات بنا سکتے تھے مگر انہوں نے یہ پاپڑ بیلنے پسند نہ کئے اور پاکدامنی سے تکمیلِ تعلیم کے بعد وطن واپس لوٹ آئے۔

لندن میں ہی انہوں نے اپنا نام محمد علی جناح بھائی بدل کر اپنا نام ایم۔ اے جناح (محمد علی جناح) رجسٹرڈ کرا لیا۔

غیرت و حمیت

حصولِ تعلیم کے بعد جب آپ عملی زندگی میں قدم رکھنے لگے تو آپ کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آئی جو کسی جسٹس کا ہونا چاہئے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کسی جسٹس تک رسائی کیسے ہو! طالب علمی سے تازہ تازہ فارغ ہوئے تھے۔ اس لئے واقفیت زیادہ نہ تھی کہ کسی کی معرفت یہ کام کرایا جا سکے۔ اور نہ ہی آپ کی غیرت اور حمیّت اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ کسی کا احسان برداشت کیا جائے اور سفارش کرائی جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد آپ نے حسبِ عادت لباس بدلا اور ایک چھپا ہوا سرٹیفکیٹ جیب میں ڈال کر چیف جسٹس کے پاس تنہا پہنچ گئے اور اچانک ان سے سوال کر دیا:۔

"جناب جسٹس میں آپ کو کس قسم کا انسان نظر آتا ہوں!"

قائدِ اعظم نفاست پسند تو تھے ہی جسٹس نے سر سے پاؤں تک آپ کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ صاف ستھرا لباس نفیس اتنا کہ کہیں شکن تک نہیں، وضع و قطع سے بڑے چست اور مستعد دکھائی دیئے، بشرے سے صداقت اور شرافت ٹپکتی ہے۔ جسٹس اس نوجوان کی یہ بیباکی دیکھ کر اس سے بہت متاثر ہوا۔ اور جواب دیا کہ:

"آپ واقعی انتہائی شریف انسان ہیں۔"

قائدِ اعظم نے فی الفور اپنی جیب سے وہ سرٹیفکیٹ نکال کر جسٹس مذکور کے سامنے رکھ دیا اور بلا جھجک ان سے کہا:

"جناب والا! جو کچھ آپ اپنی زبان سے فرما رہے ہیں۔ اس پر دستخط کر کے اپنے قلم سے بھی اس کی تصدیق فرما دیں"

چیف جسٹس اس نوجوان کی چابکدستی پر دنگ رہ گیا اور اس کے سامنے بے بس ہو کر خاموشی سے اس کیریکٹر سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیئے۔

وہ چیف جسٹس انگریز تھا۔ اس نے قائدِ اعظم کی یہ جرأت اور دیدہ دلیری دیکھ کر کہا کہ:

"اس نوجوان میں ساحرانہ کشش اور ذہانت پائی جاتی ہے اور اس سے غیر معمولی کام انجام پائیں گے۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قائدِ اعظم نے حصولِ پاکستان کے لئے ایسی جدوجہد کی۔ جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

تعلیم و تربیت قائداعظم چھ سال کے ہو چکے تھے۔ مگر انہیں ابھی کم عمر تصور کرتے ہوئے سکول میں داخل نہ کیا گیا اور نہ ہی گھر کے نزدیک تریں کوئی سکول تھا کہ بچہ بآسانی پیدل آجا سکتا۔ اس لئے انہیں گھر پر گجراتی میں تعلیم دینے کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ نو سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد آپ کو ایک پرائمری سکول میں داخل کردیا گیا۔ جہاں وہ سال بھر زیر تعلیم رہے۔ مگر اس سکول کا ماحول چونکہ اچھا نہ تھا۔ اس لئے اسے وہاں سے نکال کر سندھ کے معروف مدرسہ، مدرسۃ الاسلام میں داخل کردیا گیا۔ تاکہ وہ صحیح اسلامی سانچہ میں ڈھیلی جاسکے۔

سندھ مدرسۃ الاسلام میں آپ نے اسلامی تعلیم اور قرآن شریف کے ساتھ ساتھ ابتدائی گجراتی کی تعلیم بھی پائی۔ اس دوران کچھ عرصہ کے لئے آپ بمبئی چلے گئے اور وہاں گوکل داس تیج پرائمری سکول اور انجمن اسلام میں پڑھتے رہے۔ لیکن وہاں سے واپسی پر پھر سندھ کے مدرسۃ الاسلام میں داخل ہوگئے جس کے صدر دروازہ پر انگریزی میں یہ کتبہ لکھا تھا:۔

ENTER TO LEARN GO FORTH TO SERVE

یعنی حصولِ علم کے لئے آؤ اور خدمتِ خلق کے لئے جاؤ

پندرہ برس کی عمر میں آپ سندھ مدرسۃ الاسلام کو چھوڑ کر کرسچن مشنری سوسائٹی میں داخل ہوگئے جہاں سے آپ نے دسویں جماعت پاس کی۔ سولہ برس کی عمر میں آپ کی شادی ہوگئی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ۱۸۹۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ کو لندن بھیج دیا گیا۔

لندن پہنچنے کے بعد آپ نے داخلہ کے لئے وہاں کے معروف تعلیمی اداروں کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ پھرتے پھراتے جب آپ لنکن ان کے صدر دروازہ پر پہنچے تو اس پر "دنیا کے عظیم قانون سازوں" کی ایک فہرست لگی ہوئی تھی۔ جس پر سر فہرست سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک لکھا تھا۔ بنیادی اسلامی اور قرآنی تعلیمات کے اثر سے چونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت آپ کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اس لئے لورڈ

پر سرکارِ دوجہاں کا نامِ نامی سرِفہرست دیکھ کر اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسی ادارہ میں آپ نے بیرسٹر بننے کے لئے داخلہ لے لیا۔ جس کا آپ کو بچپن سے شوق تھا۔ اس راز پر سے قائدِاعظم نے خود ۱۹۴۷ء میں وکلاء کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے یوں پردہ اٹھایا۔

"ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسولِ اکرمؐ کی جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین مدبروں میں ہوتا ہے۔ بہت عزت تھی۔ ایک دن اتفاقاً میں لنکن ان گیا اور میں نے اس کے دروازے پر پیغمبرِ اسلام کا نامِ مبارک کھدا دیکھا تو میں نے لنکن ان میں داخلہ لے لیا۔ کیونکہ اس کے دروازے پر آنحضرتؐ کا نام مبارک دنیا کے عظیم قانون سازوں میں سرِفہرست لکھا تھا۔"

(ہمارے قائدِاعظم صہ ۲۸)

محنتِ شاقہ کے سبب قائدِاعظم نے دو سال کے قلیل عرصہ اور ۱۸ سال کی عمر میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر لیا۔ آپ پہلے ہندوستانی طالب علم تھے جنہوں نے اتنی کم عمر میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

اسلامی ماحول اور قرآنی تعلیمات اور ان کے اثرات کی قبولیت کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنا لڑکپن اور طالب علمی کا زمانہ ولغذارتہ ہونے دیا۔

ان کے سوانح نگار اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ :-

"خدا تعالیٰ نے علم کی محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ مدرسے کے بعد ان کا زیادہ تر وقت تاریخی واقعات، بڑے آدمیوں کے کارنامے اور بزرگوں کے قصے کہانیاں پڑھنے میں گزرتا۔ ان کی ایک عزیزہ فاطمہ بائی جو رشتہ میں بہن لگتی تھیں، بیان کرتی ہیں کہ" ایک رات میں نصف گئے جاگی تو میں نے محمد علی کے کمرے میں روشنی دیکھی۔ میں ان کی طرف گئی اور انہیں پڑھتا دیکھ کر کہا" بس اب سو جاؤ! اتنی رات ہو چکی ہے۔ زیادہ دیر جاگنے سے صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے"۔ اس پر انہوں نے سر اٹھایا اور آہستہ سے جواب دیا" بڑا آدمی بننے کے لئے رات تک جاگنا ضروری ہے۔ کیا آپ

نہیں چاہتیں کہ میں بڑا آدمی بنوں " (ہمارے قائدِ اعظم صد ۲۲)

قائدِ اعظم کے اخلاق ۔ ذہانت اور محنت کے سب معترف تھے ۔ وہ اچھا کھاتے ۔ اچھا پہنتے اور صاف ستھرا رہتے تھے ۔ انہیں ایسے کھیل کود سے نفرت تھی جس سے کپڑے گندے ہوں یا جسم میلا کچیلا کردیں ۔ وہ بڑے ہنس مکھ تھے اور دوست احباب کو بھی ہنساتے رہتے تھے ۔ انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی ۔ ہمیشہ سچ بولتے اور دوسروں کو بھی سچ بولنے اور وقت کی قدر کرنے کی تاکید کرتے رہتے تھے ۔ انہوں نے بڑی ناصحانہ طبیعت پائی تھی ۔ وہ اپنے دوستوں سے ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ :۔

"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ۔ وقت کی قدر کرو ۔ اس کا ایک ایک پل دنیا کے خزانوں سے قیمتی ہے ۔ علم و دولت کی کنجی ہے ۔ انسان کو کسی کام سے نہیں گھبرانا چاہیئے ۔ وہ ہمت کرے تو سب کچھ ہوسکتا ہے ۔ بڑی سے بڑی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرو ۔ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرو ۔ ناامیدی بزدلی ہے ۔ ہمیشہ سچ بولو ۔ جس بات کو ٹھیک سمجھتے ہو اسی کو ہانکے پکارے ڈنکے کی چوٹ کہو اور کسی کی ناراضگی سے مت گھبراؤ "

وہ خود بھی بزرگوں کا ادب کرتے تھے اور دوسروں کو بھی کہا کرتے تھے کہ بزرگوں کی عزت کرو ۔ ماں باپ کا ادب اور بھائی بہنوں سے پیار کرو ۔ کتاب میں جو بات اچھی معلوم ہو اسے لکھ کر یاد کرلیا کرو "

(ہمارے قائدِ اعظم صد ۲۲-۲۳)

غرض کہ بچپن سے ہی آپ کا قول و کردار قرآنی اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھا اور انہوں نے اپنے آپ کو خدا کے فضل و کرم سے شیطانی کاموں سے بچائے رکھا ۔ اور اپنے عقائد و خیالات میں خلل نہ آنے دیا ۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے کہ :۔

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (المائدہ ۱۲/۷)	بات یہ ہے کہ شراب ۔ جوا ۔ بت اور قرعہ کے تیر سب شیطانی گندے کام ہیں ان سے بچتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ ۔

آبائی مذہب اثنا عشری اور آغا خانی شیعوں کے دو معروف فرقے ہیں۔ اثنا عشری، جعفری بھی کہلاتے ہیں کیونکہ یہ حضرت جعفر صادق کے پیرو ہیں اور آغا خانی، اسماعیلی بھی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ یہ حضرت امام جعفر صادق کے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل کے ماننے والے ہیں۔ ان کے عقائد اسماعیلی فرقہ کے سربراہ سر آغا خان نے اپنی خود نوشت "سرگزشت" میں یوں تحریر کئے ہیں:-

"رسول کی وفات کے بعد خداوندی اختیار، ہدایت اور قیادت نے اپنا اظہار حضرت علی کے اندر کیا۔ جو معتقدین کے پہلے امام اور روحانی پیشوا تھے۔ حضرت علی جو حضرت محمدؐ کے ساتھی تھے۔ خُدا کے نائب ہیں حکومت ہمہ گیر ہے۔ اس کا تعلق رُوحانی معاملات سے بھی ہے اور یہ حکومت رسول کے خاندان کے وارثوں کو موروثی حق کے ذریعے سے منتقل کی جاتی ہے۔ شیعوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ یہ روحانی سرداری اور امامت جو حضرت علی کے متعلق تھی۔ اُن کی چھٹی نسل میں اُن کے ذریعہ اسماعیل کو پہنچی جن کی اولاد میں ہونے اور جن سے امامت حاصل کرنے کا میں خود دعویٰ کرتا ہوں۔ دوسرے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امامت کا سلسلہ زید سے چلتا ہے جو امام حسین کے پوتے تھے۔ ان کے علاوہ دیگر شیعوں کا جن میں ایران کے لوگوں اور ہندوستان کے شیعوں کی بڑی اکثریت شامل ہے، یہ عقیدہ ہے کہ امامت کا تعلق اب ایک زندہ امام سے ہے جو علی سے دسویں نسل میں ہیں جن کی وفات کبھی نہیں ہوئی جو زندہ ہیں اور گزشتہ تیرہ سو سال سے ہمارے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتے مگر وہ ہم کو دیکھتے ہیں۔ جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے وہ اثنا عشری کہلاتے ہیں۔" (صہ ۲۴ تا صہ ۲۶)

ملتان میں شیعیت کا آغاز ۲۴۲ھ میں ہوا۔ جبکہ عمر بن حفص گورنر تھا اور اسماعیلی فرقہ کا داعی (مبلغ) ۲۶۰ھ میں سندھ آیا جس کا دارالخلافہ اس وقت ملتان تھا۔ اسماعیلیوں

نے اپنے عقائد میں جو لچک پیدا کی اس کی وجہ سے اسماعیلی فرقہ کو سندھ میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ فرقہ اسماعیلیہ کے ایک داعی حسن پیر اسماعیلی مبلغ کی حیثیت سے بلوچستان کے راستے ایران سے آئے تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ ملتان میں قیام کیا تھا۔ "قائدِ اعظم جناح" کے سوانح نگار جی الانہ لکھتے ہیں کہ :-

"حسن پیر اسماعیلی کی سادہ اور پاکباز زندگی نے نہ صرف مسلمانوں کو ان کا گرویدہ بنا لیا بلکہ بہت سے غیر مسلم بھی ان کے دست حق پرست پر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے سندھ کے طول و عرض میں تبلیغ اسلام کی۔ پھر کچھ سے گزر کر آخر پانیلی کے قریب ایک مقام پر ڈیرا ڈال دیا۔۔۔" (ص ۱۷)

"توجوں کی تاریخ" از سیٹھ دینا نانجیانی اسسٹنٹ ریونیو کمشنر کچھ مطبوعہ ۱۸۹۲ء کے صفحہ ۲۳۰ پر حسن پیر اسماعیلی کے متعلق تحریر ہے کہ :

"حسن پیر کو گینود میں دفن کیا گیا۔ سالہا سال گزر جانے کے باوجود ریاست گونڈل کے لوگوں کی عقیدت آج بھی اسی طرح موجود ہے اور ہر سال ان کی درگاہ پر عرس ہوتا ہے۔ جس میں ان کے ہندو اور مسلمان عقیدت مند جوق در جوق شرکت کرتے ہیں"

قائدِ اعظم کے والدین اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حسن پیر اسماعیلی کے بہت معتقد تھے اور ان کی والدہ مخصوص روایتی انداز میں اپنے بچے کو وہاں لے جا کر ان کا سر مونڈانا اور وہیں اس کا عقیقہ کرنا چاہتی تھی اور اس کے شاندار مستقبل کے لئے وہیں دعا مانگنا چاہتی تھی۔ قائدِ اعظم کے والد اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہاں جانے سے بڑا گریز کرتے رہے۔ مگر اپنی بیوی مٹھی بائی کے سامنے جناح بھائی کی کچھ پیش نہ چلی اور دونوں اپنے ننھے منے بچے کو لے کر حسن پیر کی درگاہ کی طرف چل پڑے۔ جو دس میل کے فاصلہ پر واقع تھی۔ بے شمار صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد آخر یہ حسن پیر کی درگاہ تک پہنچ گئے۔ جہاں عقیقہ وغیرہ کی ضروری رسومات ادا کی گئیں اور قائدِ اعظم کے شاندار مستقبل کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ جس سے اس خاندان کی اسماعیلی پیر سے گہری وابستگی عیاں ہے۔

قائدِ اعظم بھی اپنی خاندانی روایات کے مطابق اسماعیلی عقیدہ اور مذہب کے پیروکار تھے۔ جس کا انہوں نے خود اعتراف کیا۔ جس کی تفصیل خود ان کی زبانی درج ذیل ہے:۔

"متحدہ ہندوستان کی قانون ساز مرکزی اسمبلی کے موسم خزاں کے اجلاس ۱۹۳۸ء کے موقعہ پر اجلاس سے فارغ ہو کر مسلم لیگ پارٹی کے ارکان پارٹی روم میں بیٹھ گئے۔ کیونکہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس وقت قائدِ اعظم ایک صوفہ پر تشریف فرما تھے اور حاجی سر عبداللہ ہارون۔ مولانا ظفر علی خان۔ مولوی سید غلام بھیک نیرنگ۔ مسٹر محمد نعمان اور حاجی عبدالستار اردگرد بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ اس نشست میں قائدِ اعظم نے اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:۔

"میرے آباؤ اجداد لوہانہ راجپوت تھے۔ یہ پنجاب کے بعض حصوں بالخصوص ملتان میں ابھی تک آباد ہیں۔ میرے مورثِ اعلیٰ حضرت غوثِ اعظمؒ کے خاندان کے ایک معزز فرد پیر سیّد عبدالرزاق صاحب کے ہاتھ پر شرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اس لئے وہ خواجہ کہلاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ لفظ بگڑ کر خوجہ ہو گیا۔ میں اور میرا تمام خاندان ہز ہائی نس آغا خان کو اپنا پیر و مرشد سمجھتا تھا۔ لیکن میری بڑی بہن کی شادی کے موقعہ پر اختلاف رائے ہوا۔ جس سے یہ رشتۂ عقیدت منقطع ہو گیا۔"

(بے تیغ سپاہی صہ ۵۵)

اس کے بعد قائدِ اعظم نے اثنا عشری مسلک اپنا لیا۔

تاریخی پس منظر

مُسلم کش تحریکیں

متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک ہزار برس تک برسرِ اقتدار رہے اور ازراہِ رواداری اکثر بادشاہ اور صوبیدار ہندوؤں کو میر منشی (وزیرِ اعظم) اور مشیرِ مال مقرر کرتے رہے اور گرانقدر انعام و اکرام سے نوازتے رہے۔ مگر اس ہندو نوازی کے باوجود وہ مارِ آستین کی طرح متحدہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کے لئے کوشاں رہے کیونکہ وہ ہندوستان کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندو یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ مغربی جمہوریت کی بنا پر بربنائے اکثریت، مسلم اقلیت کو غلام بنا سکیں گے۔ جس کے لئے کانگرس وجود میں آئی۔ جس کی پشت پناہی ہندو سبھا نے سنبھالی۔ سیواجی مرہٹہ کے مسلم کش منصوبہ کے تحت سرزمینِ ہند کو مسلمانوں کے خون سے رنگین کرنے کا کام راشٹریہ سیوا سنگ نے اپنے ذمہ لیا۔ مسلمانوں کو شدھی کے ذریعہ ہندو بنانے اور ہندو دھرم کے احیاء کا فریضہ آریہ سماج تحریک سرانجام دینے لگی۔ اس طرح ہندو متعدد مسلم کش تحریکیں چلاتے رہے اور انگریزوں کو یہ یقین دلاتے رہے کہ بغاوت کے ذمہ دار تمام تر مسلمان تھے اور ہندو فی الواقعہ انگریزی راج چاہتے تھے۔ اس طرح ہندوؤں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لئے حکومتی سطح پر بھی ایک محاذ قائم کر لیا۔ جس کے نتیجہ میں سندربن کے انگریز کمشنر نے اپنا یہ اعلان گزٹ کرا دیا کہ:

"جو ملازمتیں خالی ہیں۔ ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے"

جس پر دوسرے صوبوں اور کمشنریوں میں بھی عملدرآمد شروع ہو گیا اور ہر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں۔ محکموں اور شعبوں میں مسلمانوں کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ چودھری محمد علی اپنی

کتاب "ظہورِ پاکستان" میں لکھتے ہیں :-

" ہندو ہمیشہ سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں سے ناروا امتیازی سلوک کرنے کے عادی تھے۔ اب ان کا امتیازی سلوک بہت کھلم کھلا اور شدید ہو گیا۔ مسلمانوں کو مساوی مواقع دینے سے انکار کر دیا گیا اور انتظامیہ میں انہیں کما حقہ حصہ سے محروم کر دیا گیا۔ جن سرکاری اداروں کے اخراجات تمام ٹیکس گزار ادا کرتے تھے، ان میں ہندو راج اور ہندو ثقافت کے مظاہر و علامات اختیار کر لیئے گئے۔ تعلیم کے لئے ودّیا مندر کھولے گئے۔ سکولوں میں روزانہ پڑھائی کا آغاز کانگرس کے جھنڈے کو سلامی دینے اور ایک بدنام زمانہ مسلم دشمن گیت " بندے ماترم " کے گانے اور پوجا یا گاندھی کی تصویر کی پرستش سے ہوتا تھا۔ مسلمان ایسے معمولات سے گہری نفرت کرتے تھے۔ کنوئر کھشا پراسرار نے ایسی صورتیں اختیار کر لیں جن سے نہ صرف غریب مسلمانوں کو اقتصادی طور پر سخت نقصان پہنچنے لگا بلکہ ایسے تصورات کے سامنے انہیں سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا جانے لگا، جن سے مسلم دل و دماغ بیگانہ تھے۔ اردو جو مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ تہذیبی ورثہ تھی، اس کو ہٹا کر اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی باقاعدہ کوشش شروع ہو گئی۔ ہندی کو سرکاری سرپرستی ملی۔ اردو سکول بند کر دیئے گئے یا انہیں ہندی سکولوں میں ضم کر دیا گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے دورِ شباب میں گاندھی اکثر یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ اردو اور ہندی دونوں ایک ہی زبان ——— ہندوستانی ——— ہیں، جنہیں یکساں طور پر خوش اسلوبی سے فارسی یا دیوناگری رسم الخط میں لکھا جا سکتا ہے۔ اس نے خود بھی اردو رسم الخط سیکھا اور ہر ایک کو دونوں رسم الخط سیکھنے کا مشورہ دیتا تھا۔ لیکن اب اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ اردو چونکہ قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس لئے یہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور ہندی ۔ ہندوستانی ہی ہند کی قومی زبان ہے۔ آخر میں ہندوستانی کا لفظ بھی ترک کر دیا اور

ہندی کے ہی قومی زبان ہونے کا اعلان کر دیا گیا "

آزادی کی کشمکش میں ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ وہاں ہندوؤں نے برسرِ اقتدار آتے ہی مسلم کشی شروع کر دی۔ جس کی تفتیش و تحقیق کے لئے راجہ پیرپور کی زیرِ صدارت ایک کمیٹی قائم ہوئی۔ جس کی رپورٹ سے ثابت ہو گیا کہ :-

"کانگرسی حکومتیں مختلف ذرائع سے مسلمانوں پر ہندو ثقافت ٹھونسنے کی کوشش کر رہی ہیں اور مسلمانوں سے ناروا امتیازی سلوک کر رہی ہیں۔ اگر مسلمان ان کوششوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں تو انہیں امن و امان میں خلل اندازی کا مرتکب قرار دے کر حکومت کی جابرانہ مشینری ان کے خلاف استعمال کی جاتی ہے۔ بہار میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا جو قتلِ عام کیا۔ اس کی تحقیقات کی "شریف رپورٹ" بھی مذکورہ بالا نتائج پر پہنچی۔

دوسری طرف ہندو ساہوکارہ سسٹم۔ رہن اور سود در سود کے ذریعہ ہندوؤں نے اکثر مسلمانوں کی جائیدادوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ذرائع معاش محدود ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت مفلوک الحال تھی۔ صنعت و حرفت پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ ننانوے فیصد کارخانے۔ ملیں اور فیکٹریاں وغیرہ ہندو آبادیوں میں قائم تھیں۔ حتیٰ الوسع وہ مسلمانوں سے سودا نہ خریدتے تھے۔ غرض کہ ہر میدان میں مسلم کُشی کا دَور دورہ تھا۔

دفاعی تدبیریں ان نامساعد حالات میں ایک طرف تو سر سید احمد خان نے علی گڑھ تحریک چلا کر مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں دلانے اور ایوانِ حکومت میں گھسنے کی سہولت پیدا کی۔ سیاسی محاذ پر لڑنے کے لئے سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ میدانِ عمل میں نکلی۔ دینی میدان کی کمان مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حصّہ میں آئی۔ جن کے بارے میں مورخِ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

"یہ مردِ درویش ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل

نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس
کے سامنے دین کی صحیح مثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ زندگی کی تصویر
میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مصروف تھا۔ اس
نے پوری زندگی اس امر میں صرف کر دی کہ مسلم کی تصویرِ حیات کو اس شبیہ کے
مطابق بنا دے جو دینِ حق کے مرقّع میں نظر آتی ہے۔"

(جامع المجددین صد ۲۸)

مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ اپنے نورِ بصیرت سے یہ دیکھ رہے تھے بلکہ اس کا برسرِ عام
اعلان فرما رہے تھے کہ:۔

"اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا وقت نہیں آیا۔ جیسا کہ آج
درپیش ہے۔" (خطبۂ صدارت الٰہ آباد کانفرنس)

اس کی وہ دو وجوہات تبلاتے تھے:۔

۱۔ "ملتِ اسلامیہ نے کوئی ایسا رہنما پیدا نہیں کیا جسے اعانتِ ایزدی یا اپنے
وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات
کی روح اور تقدیر کیا ہے اور دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ
جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔

دوسرا مرض مسلمانوں کے اندر یہ گھر کر چکا تھا کہ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں
رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن
ہیں۔ اس لئے قوم کے عام افکار اور سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

علامہ اقبال نے اس ابتلار سے بچنے کی واحد صورت یہ بیان کی کہ:۔

"کامل تنظیم اور اتحادِ عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے (کیونکہ) ایک
سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ آڑے وقتوں
میں اسلام نے ہی مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام
کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور

اس کے زندگی بخش عمل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں ازسرِنو جمع ہو جائے گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

(خطبہ صدارت)

راہِ عمل جس امر کی طرف علامہ اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو قوم کی توجہ مبذول کرائی۔ وہ دربارِ اشرفیہ میں نہ صرف جون ۱۹۲۸ء میں زیرِ بحث آچکا تھا۔ بلکہ اس کے حصول کے لئے راہِ عمل بھی تجویز ہو چکی تھی۔ جون ۱۹۲۸ء میں کانگرسی لیڈر مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور خلافتی لیڈر مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے تو حضرت تھانویؒ نے انہیں کھلے لفظوں میں فرمایا کہ،

"دل یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین وغیرہ کا اجرار احکامِ شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال ہو۔ نظامِ زکواۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علیٰ ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہئے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔"

(سیرتِ اشرف باب ۵۰)

مگر ان حضرات نے یہ جانتے ہوئے کہ ع قلندر ہرچہ گوید، دیدہ گوید۔ اسے کوئی اہمیت نہ دی اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے چونکہ اس زہر کا تریاق سوائے پاکستان کے اور کوئی نہ تھا۔ اس لئے حالات سے مجبور ہو کر حکیم الامت علامہ اقبال نے بھی ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو قوم کو وہی مشورہ دیا جو جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ کانگرس علمار کو دے چکے تھے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ:-

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں ..... (کیونکہ) یہ امر کسی طرح مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں مغربی طرز کے

جمہوریت کا نفاذ کیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان
میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے، بالکل حق بجانب ہے۔"
(خطبہ صدارت الہ آباد کانفرنس)

گویا مجدد وقت کی غیبی تائید اس دور کے مردِ قلندر نے بھی کر دی۔

تخیلِ پاکستان | مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی نے جون ۱۹۲۸ء میں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے روبرو بالفاظِ ذیل پاکستان کا تخیل پیش کیا تھا:۔

"دل یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال ہو۔ نظام زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علیٰ ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہونی چاہیئے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔"

(سیرتِ اشرف باب ۵)

جون ۱۹۲۸ء کی اس تاریخی ملاقات پر روشنی ڈالتے ہوئے مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریا بادی مدیر شہیر "صدقِ جدید" لکھنؤ، اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:۔

"۱۹۲۸ء تھا اور مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آ جانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت "گورنمنٹی" آدمی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا، جان کر یا بے جانے، بہرحال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوشِ دینی اور غیرتِ ملّی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔

پہلے پہل اس قسم کی آواز نہیں کان میں پڑی۔ بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اُس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا۔ لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفسِ مقصد یعنی حکومتِ کافرانہ سے گلوخلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومتِ وقت سے جو مخالفت تھی وہ اس کے "کافرانہ" ہونے کی بنار پر تھی نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنار پر۔" (نقوش و تاثرات صد ۲۳)

راقم کی درخواست پر اس" بالکل صاف جزو" کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا دریا بادی اپنے گرامی نامہ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۵۵ء میں لکھتے ہیں کہ:-

"حضرتؒ کو بعض معاصر علمار کی طرح "جنگِ آزادی" "جنگِ حقوق" "آزادیٔ وطن" وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ انکے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں، تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلامی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالاسلام کی سکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی

حضرت تھانویؒ ان رہنماؤں میں سے نہ تھے، جو اپنی" ملکی و ملّی خدمات" اور اپنے" حقیقت افروز بیانات" اخبارات میں شائع کرانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ایک ایسے رہنما اور مصلح تھے جو انبیائی طریق پر نہایت خاموشی کے ساتھ اصلاحِ اُمت اور خدمتِ خلق میں مصروف تھے جو ایسی خدمات کا اظہار نمود و نمائش اور ریار میں داخل سمجھتے تھے۔ وہ اپنی سوانح حیات تک کا لکھا جانا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اسی لئے امور بالا کی تفصیل اخبارات کو نصیب نہ ہوئی۔"

نظامِ پاکستان بحالاتِ بالا دربارِ اشرفیہ میں حصول وبقاء پاکستان کا لائحہ عمل اور نظامِ پاکستان کا پورا نقشہ اس وقت پیش ہوا۔ جب کہ پاکستان چاہنے والوں کو ابھی اس کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنے دارالاسلام کا جو نقشہ پیش کیا تھا، قائدِ اعظمؒ بھی اسی کے مطابق نظامِ پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائدِ اعظمؒ جب حیدرآباد تشریف لے گئے تو ان سے "اسلامی حکومت" کی وضاحت چاہی گئی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں نوجوان طلباء کو تبلایا کہ :-

"اسلامی حکومت کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست ومعاشرت میں ہماری آزادی وپابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔" (حیاتِ قائدِ اعظم صـ۴۲۸)

غرض کہ :-

۱۔ انہی اصولوں پر قائدِ اعظم نے پاکستان کی جنگ لڑی۔

۲۔ انہی اصولوں کی حکومت کے لئے قوم نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا، جو جنگِ پاکستان کے ہر مرحلہ پر پوچھتی تھی کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ تو اسے جواب دیا جاتا تھا لا الٰہ الا اللہ۔

۳۔ انہی اصولوں کے مطابق دربارِ اشرفیہ کے فیض یافتہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی کوششوں سے "قرار دادِ مقاصد" پاس ہوئی جو اب دستورِ پاکستان کا جزو بن چکی ہے۔

۴۔ انہی اصولوں پر پہلی مجلس دستور ساز نے نظامِ مملکت کی بنیاد رکھی کہ آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائیگا جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

۵ - انہی اصولوں کی تعلیم پہلی مجلس دستورساز نے مملکت کے مسلمانوں کے لئے لازمی قرار دی تھی اور

۶ - انہی اصولوں پر چلنے میں پاکستان کے بقاء کا راز مضمر ہے ۔

عملی جدوجہد حضرت تھانویؒ نے صرف حصول پاکستان کے لئے راہِ عمل یا نظامِ پاکستان کا خاکہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہ فرمایا تھا، بلکہ اس کے لئے عملی جدوجہد بھی اُسی زمانہ سے شروع کردی تھی ۔ مثلاً :-

۱ - سب سے پہلے آپ نے ہی ہندوستان میں اسلامی قوانین رائج کرنے کی مہم شروع کی تھی ۔

۲ - سب سے پہلے کانگرس کے خلاف اور مسلم لیگ کی حمایت میں جماعتِ علماء میں سے دربارِ اشرفیہ ہی سے اعلان جاری ہوا ۔

۳ - سب سے پہلے حضرت تھانویؒ ہی نے مسلم لیگ کی تطہیر اور قائدِ اعظم میں تدیّن پیدا کرنے کی کوشش کی ۔

تخیّل پاکستان کے ساتھ ساتھ حضرت تھانویؒ کو اس کا بھی سخت احساس تھا کہ :-

"مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیرالمومنین ہو۔ اور جس کو امیرالمومنین بنایا جائے، اس کے اندر تین صفات ہوں ۔ ایک تدیّن یعنی وہ دیندار ہو۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔ اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدیّن تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں" (آثار رحمت صہ ۱۰۴)

حضرت تھانویؒ کی یہ تمام جدوجہد ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس کے اندر قرارداد پاکستان پاس کرنے سے پہلے کی ہے ۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ نے نہ صرف سب سے پہلے پاکستان کا تخیّل پیش کیا، بلکہ اس کے حصول کے لئے عملی جدوجہد کرنے

والوں میں بھی آپ کا درجہ السابقون الاوّلون کا ہے۔

آئین پاکستان | ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس سالانہ اجلاس میں پیش ہونے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبران کی ایک میٹنگ نواب محمد اسماعیل خان کی زیرِ صدارت اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے منعقد ہوئی کہ :۔ "پاکستان میں کس قسم کا آئین ہوگا"؟

اس ضمن میں پہلی تجویز کا متن یہ تھا :۔

"پاکستان میں جو حکومت بنے گی۔ وہ خلافتِ راشدہ کے طرز کی ہوگی"۔

دوسری تجویز کے الفاظ یہ تھے :۔

"پاکستان کا آئین قرآن و سنت کے مطابق بنایا جائے گا"۔

تیسری اور چوتھی تجویز کا بھی خفیف سا لفظی ہیر پھیر کے ساتھ یہی مطلب تھا۔ بالآخر یہ واضح اور جامع تجویز مرتب ہوئی :۔

"پاکستان میں جو آئین ہوگا وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوگا اور رائج الوقت قوانین میں جلد سے جلد شریعت کے مطابق تبدیلی کی جائے گی"۔

چنانچہ جب یہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہوئی تو قائداعظم نے ہر شخص کو اس پر کھل کر بولنے کی دعوت دی۔ مگر کسی نے اس کی مخالفت نہ کی جو شخص بھی بولا وہ اس تجویز کی موافقت میں ہی بولا۔ تجویز بالا میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا کہ :۔

"پاکستان میں جو لوگ برسرِ اقتدار آئیں گے وہ اس قرارداد کے پابند ہوں گے"۔

اس تجویز کے پاس ہونے سے مخالفین کے منہ بند ہوگئے۔ اور پاکستان کے آئین کا مسئلہ عام کھلے اجلاس میں طے ہوگیا کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوگا اور رائج الوقت قوانین اسی سانچے میں ڈھال دیئے جائیں گے۔

۱۹۴۵ء کے انتخابات مذکورہ بالا قرارداد کی روشنی میں لڑے گئے۔ جن میں مسلم لیگ

نے اتنی نمایاں کامیابی حاصل کر لی کہ اسے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت ——— حاصل ہو گئی اور پاکستان کو مسلمانوں کا نصب العین تسلیم کر لیا گیا۔ اب حصولِ پاکستان کی راہ میں انگریز روڑہ بن گیا۔ جو ہندوؤں کی ملی بھگت سے ہندوستان کو غیر منقسم متحدہ حالت میں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود کے مصداق ہندوؤں نے اپنی مسلم کش فطرت سے مجبور ہو کر ۱۹۴۶ء میں بہار میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر نخلِ پاکستان کی آبیاری کی اور مسلمانوں کے ایک علیحدہ قوم ہونے کی بدستِ خود تصدیق و توثیق کر دی۔ قائدِ اعظم کے ہاتھ مضبوط کر دیئے اور دو قومی نظریہ واضح شکل میں منظرِ عام پر آ گیا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران یہ سوال کئی مرتبہ اٹھا کہ پاکستان کا فائدہ کیا؟ جس کا جواب قائدِ اعظم نے ۲۶ جولائی ۱۹۴۴ء کو راولپنڈی میں یتیم خانہ انجمن فیض الاسلام کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے یہ دیا:

"پاکستان ہی میں برصغیر کے مسلمانوں کی نجات ہے۔ کیونکہ متحدہ ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے غلامی کا طوق گردنوں میں پڑ جائیگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مطالبہ پاکستان کی خاطر سب مسلمان متحد ہو کر رہیں۔ تاکہ مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت برقرار رہے۔" (نقوشِ قائدِ اعظم ص ۱۴۷)

اس امر کی مزید وضاحت قائدِ اعظم نے اپنی متعدد تقریروں میں یوں فرمائی کہ:-

"مسلم لیگ کا مشن اور پاکستان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ پاکستان میں اللہ کے دین کا نظام قائم ہو گا .... ہمارا مطالبہ پاکستان اس مؤقف پر ہے کہ چونکہ متحدہ ہند میں، ہندو ہم سے تین گنا زائد ہیں۔ لہٰذا تمام فیصلے اور قوانین ہندو منشار کے مطابق ہوں گے اور مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں اپنے عقائد کے مطابق نہ تو قانون بنا سکیں گے اور نہ اپنی تہذیب، تمدن اور زبان کو محفوظ رکھ سکیں گے۔"

(ایضاً ص ۲۱)

قائدِ اعظم نے بلا تیر و تفنگ اپنی خداداد فراست، ذہانت، دیانت اور سیاست سے پاکستان کی جنگ مسلمانوں کو ۱۹۴۷ء میں جیت دی۔

قائدِ اعظم نے یہ اسلامی جنگ جیتنے کا تاریخی کارنامہ عام لیڈروں کی طرح اپنے نامۂ اعمال میں نہ ڈالا۔ بلکہ اسے قادرِ مطلق کی مشیّت قرار دیتے ہوئے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے معالج ڈاکٹر ریاض علی سے فرمایا:-

"ڈاکٹر جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے تو میرا سر عجز و نیاز کے جذبات کی فراوانی سے بارگاہِ ربّ العزت میں سجدۂ شکر بجا لانے کے لئے جھک جاتا ہے۔ یہ مشیّتِ ایزدی ہے کہ وہ قوم جس کو برطانوی سامراج اور ہندو بنیا ازم نے قرطاسِ ہند سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی، آج وہ قوم آزاد ہے۔ اس کا اپنا ملک ہے۔ اپنا جھنڈا ہے۔ اپنی حکومت ہے، اپنا سکّہ ہے، اور اپنا آئین و دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی انعام ہو سکتا ہے۔ خدا کے انعام عظیم کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض ہے۔ پاکستان ایک تحفہ ہے اور خداوندی تحفے کا تحفظ ہر مسلمان کا ایمان ہونا چاہیئے۔ اگر پاکستانی نیک نیتی، دیانت داری، خلوص نظم و ضبط اور اعمال و افعالِ صالح سے دن رات کام کرتے رہے، ان میں بدی اور نفاق، جاہ طلبی اور ذاتی مفاد کا جذبہ نفریں پیدا نہ ہوا تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ چند سالوں ہی میں دنیا کی بڑی قوموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ ان کا ملک امن و آشتی، تہذیب و تمدّن، ثقافت و شرافت کا مرکز ہوگا اور اس کی حدود سے ترقی کی شعاعیں نکل کر ایشیائی ممالک کی رہنمائی و رہبری کریں گی، ان کو ترقی اور امن کا راستہ دکھائیں گی"۔ (نقوش قائدِ اعظم، ۲۴)

خالص اسلامی حکومت | آج بعض مفاد پرست۔ سرمایہ دار مسلم لیگی قائدِ اعظم کے مقصد پاکستان کی من مانی تعبیریں کر رہے ہیں اور انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ یہ راگ

الاپتے پھرتے ہیں کہ "قائدِ اعظم کا مقصد اسلامی حکومت کا قیام نہیں تھا۔ وہ دراصل ایک سیکولر یا سوشلسٹ یا مغربی طرز کی جمہوری حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اسلام کا نام تو انہوں نے محض لوگوں کو دھوکا دینے اور ان کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا" حالانکہ آجکل کے بعض سیاسی لیڈروں یا اربابِ اقتدار کی طرح انہوں نے کبھی منافقت سے کام نہ لیا۔ نہ کبھی مطلب براری کے لئے گرگٹ کی طرح رنگ بدلے انہوں نے انگلستان سے واپسی کے بعد کھلے لفظوں میں ________________

مولانا ظفر علی خان اور سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں مندرجہ ذیل بیان دیا تھا جو ماہنامہ "منارہ" کراچی میں شائع ہوا۔ جسے روزنامہ ندائے ملت۔ لاہور نے اپنی ۱۵ اپریل ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں نقل کیا۔

"میں لندن میں امیرانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب میں اسے چھوڑ کر انڈیا اس لئے آیا ہوں کہ یہاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی مملکت یعنی پاکستان کے قیام کے لئے کوشش کروں اگر میں لندن میں رہ کر سرمایہ داری کی حمایت کرنا پسند کرتا تو سلطنتِ برطانیہ جو دنیا کی عظیم ترین سلطنت تھی، مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب اور مراعات سے نوازتی۔ اگر میں روس چلا جاؤں یا کہیں بیٹھ کر سوشلزم، مارکسزم، یا کمیونزم کی حمایت شروع کر دوں تو مجھے بڑے سے بڑا اعزاز بھی مل سکتا ہے اور دولت بھی مگر علامہ اقبال رح کی دعوت پر میں نے دولت اور منصب دونوں کو تج کے انڈیا میں محدود آمدنی کی دشوار زندگی بسر کرنا پسند کیا ہے تاکہ پاکستان وجود میں آئے اور اس میں اسلامی قوانین کا بول بالا ہو کیونکہ دنیا کی نجات اسلامی نظام ہی میں ہے۔ صرف اسلام ہی کے ملی عملی اور قانونی دائروں میں آپ کو عدل، مساوات، اخوت، محبت، سکون اور امن دستیاب ہو سکتا ہے۔ برطانیہ، امریکہ اور یورپ کے سارے بڑے بڑے سیاستدان مساوات کا راگ الاپتے ہیں۔ روس کا نعرہ بھی مساوات اور ہر مزدور اور کاشتکار کے لئے روٹی، کپڑا اور سر چھپانے کی جگہ مہیا کرنا ہے۔

مگر یورپ کے بڑے بڑے سیاستدان عیش و عشرت کی جو زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ وہاں کے غریبوں کو نصیب نہیں۔ محمد علی جناح کا لباس اتنا قیمتی نہیں جتنا قیمتی لباس یورپ کے بڑے بڑے لوگ اور روس کے لیڈر زیب تن کرتے ہیں۔ نہ محمد علی جناح کی خوراک اتنی اعلیٰ ہے۔ جتنی سوشلسٹ اور کمیونسٹ لیڈروں اور یورپ کے سرمایہ داروں کی ہے۔ ہمارے پیغمبرؐ اور خلفائے راشدینؓ نے سارا اختیار ہوتے ہوئے خود غریبانہ زندگی بسر کی مگر رعایا کو خوش اور خوش حال رکھا۔

مَیں یہ دیکھ رہا ہوں کہ انڈین کانگرس حکومت بنانے کے بعد برطانوی ٹھگوں کو تو یہاں سے نکال دے گی مگر پھر ٹھگ خود بن جائے گی۔ یہ لوگ صرف مسلمانوں ہی کی آزادی ختم نہیں کریں گے بلکہ اپنے لوگوں کی آزادی بھی ختم کر دیں گے۔ اس لئے ہم سب کو پاکستان کے قیام کے لئے زبردست کوشش کرنی چاہیئے۔ ذرا خیال فرمایئے کہ اگر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر مبنی حکومت قائم ہو جائے تو افغانستان، ایران، ترکی، اردن، بحرین، کویت، حجاز، عراق، فلسطین، شام، ٹیونس، مراکش، الجزائر اور مصر کے ساتھ مل کر یہ کتنا عظیم الشان بلاک بن سکتا ہے۔

اقبالؒ کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ کوئی سوشلسٹ یا کمیونسٹ مسلمان نہیں ہو سکتا خواہ وہ پیر مولانا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ سوشلزم اور کمیونزم کے سارے بانی یہودی تھے۔ آپ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ سوشلزم اور کمیونزم مسلمانوں کے لئے ایسا زہر ہے۔ جس کا کوئی تریاق نہیں۔ آپ کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہودی، انگریز، سوشلسٹ، کمیونسٹ اور سکھ سب مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہیں۔"

شاہی دربار سبّی بلوچستان میں ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا:-

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر

چلنے میں ہے۔ جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام نے بتایا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔"

(خطبات قائدِ اعظم جناح)

افواج پاکستان سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کو فرمایا:۔

"اب آپ کو اپنے ہی وطنِ عزیز کی سرزمین پر اسلامی جمہوریت، معاشرتی عدل اور مساوات انسانی کے اصولوں کی پاسبانی کرنی ہے۔"

(خطبات قائدِ اعظم جناح)
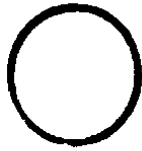
تبلیغی مہم

مذہبی تعلیم قائدِاعظم کے سب سوانح نگار اس امر پر متفق اللسان ہیں کہ قائدِ اعظم ایک معزز شیعہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے کسی دینی درسگاہ میں باقاعدہ مذہبی تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ بلکہ میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی تقریباً سولہ سال کی عمر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ جہاں وکالت پاس کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے سیاسی بصیرت بھی حاصل کی تھی۔ قائدِاعظم کی تعلیم و تربیت چونکہ ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی۔ جہاں مذہب کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں کے اثرات کے ماتحت وہ بھی مذہب و سیاست کو الگ الگ رکھنا چاہتے تھے۔

مسلم سیاست ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت کے قیام کے سلسلہ میں سب سے پہلے وسط ۱۹۲۸ء میں تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ سے جو آواز بلند ہوئی تھی، وہ علامہ اقبال کی تائید غیبی سے ۱۹۳۰ء کے آخر میں عوام تک پہنچ چکی تھی اور اسی سال قائدِ اعظم سیاسیاتِ ہند سے عارضی کنارہ کشی کر کے لندن چلے گئے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں جب وہ یہاں واپس تشریف لائے تو بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس وقت :۔

> "مسلم سیاست ایک جسدِ بے جان تھا اور عام طور پر یہی محسوس کیا جاتا تھا کہ مولانا محمد علی مرحوم کا جانشین مسلمانوں کو ملنا دشوار ہے۔ مسلمان اہلِ فکر

اپنے سیاسی رہنماؤں کی طرف سے بددل تھے۔ مسلمان رہنما یا تو انگریزوں کی خوشامد کو اپنا شیوہ بنا چکے تھے اور جو اس طرزِ عمل سے بیزار تھے، وہ ہندو سیاست کا شکار تھے۔ ایک جماعت انگریز پرست سمجھی جاتی تھی اور دوسری ہندو پرست۔ مسلمانوں کے مفاد کے لئے انگریزوں اور ہندوؤں سے الجھنے والے یا کم از کم ایسے لوگ جو اسلامی مفاد کو دوسری مصلحتوں پر مقدم رکھیں، بہت کم تھے۔"

(نوائے وقت ۲۶ دسمبر ۱۹۵۵ء)

تخریبی حملہ

۱۹۳۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں۔ انگریز اور کانگرس تو قائدِ اعظم نے انہیں بر وقت للکارا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہی نہیں۔ ایک تیسرا فریق بھی ہے یعنی مسلمان تو اس شیر کی گرج سے کانگرس کے ایوان اقتدار میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ ادھر مسلم لیگ نے قائدِ اعظم کو لیگ کا مستقل صدر منتخب کرکے اور نئی انتخابی پالیسی کا اعلان کرکے کانگرس کو چیلنج کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگرس نے اپنی "توپوں" کا رُخ قائدِ اعظم کی طرف پھیر دیا اور بقول مسٹر خورشید حسن:-

"ایک طرف تو ہندوستان میں کانگرسی اور ان کے زرخرید ایجنٹ قائدِ اعظم کو کافر، مغربی تہذیب کا دلدادہ، اسلام سے بے بہرہ اور انگریز کا پٹھو کہہ کر ان سے مسلمانوں کو دور رکھنے کی ناکام کوشش کرتے رہے اور عامۃ المسلمین کو بھڑکاتے رہے اور ساتھ ہی دوسرے بیرونی ممالک اور خاص کر انگلستان میں ان کے سفیر قائدِ اعظم کو رجعت پسند، فرقہ پرست، لکیر کے فقیر، مذہبی جنونی اور نہ جانے کس کس فرضی رنگ میں پیش کرکے آزادی پسند انگریز قوم کی نظروں میں ان کی سیاسی پوزیشن کمزور کرتے رہے۔"

(بحوالہ صدر)

احساسِ تبلیغ مگر بمصداق ؏

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کانگرس اور اس کی معاون مسلم جماعتوں کی ہر تخریبی کوشش تعمیرِ ملّت کا باعث بنتی گئی مسلمان جو ہندو سامراج اور انگریز سامراج کے درمیان گیہوں کی طرح پس رہے تھے، جہدللبقا کے لئے ایک نقطہ پر جمع ہو گئے اور مسلم لیگ نے قائدِ اعظم کی زیرِکمان ان کی حفاظت و مدافعت کے لئے مورچہ لگا دیا۔ اگرچہ اس وقت تک عام طور پر یہی خیال تھا کہ:۔

"نہیں بنے گا پاکستان"

مگر تھانہ بھون کا مردِ دوربین اپنی چشمِ فراست سے صاف دیکھ رہا تھا کہ:۔

"بن کے رہے گا پاکستان"

اس لئے اس دُور اندیش اور خیر اندیش کو اب یہ فکر دامنگیر ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں جو اسلامی سلطنت قائم ہو، اس کا نظام کتاب و سنت کے مطابق ہو اور یہ تبھی ممکن تھا کہ امیرِ سلطنت اور ارکانِ سلطنت خود کتاب و سنت کے پیرو ہوں۔ اس لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اربابِ مسلم لیگ کو تبلیغ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

دیداری جس کی تفصیل تھانہ بھون کے رئیس اعظم، دربارِ اشرفیہ کے سفیر، خانقاہ امدادیہ کے مہتمم اور حضرت تھانوی کے برادرزادہ حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کی "رودادِ تبلیغ" میں یوں درج ہے:۔

"واقعہ مئی ۱۹۳۸ء کا ہے کہ ایک روز دوپہر کا کھانا کھا کر میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ جو حضرت حکیم الامت کی سہ دری کے سامنے تھا۔ حضرت حکیم الامت دوپہر کا کھانا نوش فرما کر قیلولہ کے لئے خانقاہ میں تشریف لائے۔ اپنی سہ دری میں پہنچ کر مجھے آواز دی۔ میں فوراً حاضر ہوا اور سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت سر جھکائے ہوئے کچھ متفکر تشریف فرما تھے۔ اس زمانہ

تک پاکستان کا مشہور ریزولیوشن لاہور پاس نہیں ہوا تھا مگر کانگرس اور ہندؤوں کی ذہنیت بہت کچھ بے نقاب ہوچکی تھی ۔ اور عوام و خواص کی زبان پر یہ آگیا تھا کہ ہندو کے ساتھ مسلمان کا نباہ ناممکن ہے ۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے علیحدہ سلطنت قائم کرنا ضروری ہے ۔ غرض حضرت نے دو تین منٹ کے بعد سر اٹھایا اور جو ارشاد فرمایا ، اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور بحمد للہ حافظہ میں محفوظ ہیں ۔ آپ نے فرمایا :۔

" میاں شبیر علی ! ہوا کا رُخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جاویں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی ۔ جن کو آج سب فاسق و فاجر کہتے ہیں ۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی ۔ لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ یہی لوگ دیندار بن جاویں اور بھائی آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جاوے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں ۔ یورپ والوں سے معاملات ساری دنیا سے جوڑ توڑ ، ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیا داروں ہی کا کام ہے ۔ مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب بھی نہیں دیتا ۔ اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے اور پھر سلطنت ان ہی کے ہاتھ میں رہی تو چشم ما روشن دلِ ما شاد ۔ کہ ہم خود سلطنت کے طالب ہی نہیں ۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو ، وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور بس ! تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو "۔ میں نے یہ ارشاد سن کر عرض کیا کہ پھر تبلیغ نیچے کے طبقہ یعنی عوام سے شروع ہو یا اوپر کے طبقہ یعنی خواص سے ؟ اس پر ارشاد فرمایا کہ :۔

" اوپر کے طبقہ سے کیونکہ وقت کم ہے ۔ خواص کی تعداد کم ہے اور الناس علیٰ دین ملوکہم ۔ اگر خواص دیندار اور دیانتدار بن گئے ، تو انشاء اللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی "۔ (روئیداد صد ا ، ۲)

پہلا تبلیغی وفد ۴ جون ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ارباب لیگ کو تبلیغ کرنے کی غرض سے حضرت تھانوی نے اس اجلاس کے زمانہ میں ایک تبلیغی وفد بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ آپ نے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو اس وفد کا امیر مقرر فرمایا اور مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی اور سہارنپور کے ایک تیسرے صاحب کو اس وفد کے ارکان کے طور پر انتخاب فرمایا۔ وفد کے اخراجات کے لئے آپ نے مبلغ تین سو روپیہ اپنی جیب خاص سے مولانا شبیر علی صاحب کے حوالے کئے اور انہیں فرمایا کہ :-

"مولانا شبیر احمد ریل کے جس درجہ (سیکنڈ یا فرسٹ) میں سفر کرنا چاہیں، ان کے لئے اسی درجہ کا ٹکٹ لیا جائے اور تم لوگ تھرڈ یا انٹر میں سفر کرنا۔ اگر بمبئی میں خرچ کی اور ضرورت ہو، تو حکیم سعید صاحب گنگوہی (معروف حکیم اجمیری) سے لے لینا اور بمبئی ہی سے بذریعہ خط اس قرض کی رقم کی مجھے اطلاع دے دینا تاکہ میں ان کو روانہ کردوں۔ واپس آکر بتاؤ گے تو ادائیگی میں دیر ہو جائے گی"۔ (روئیداد صہ ۲)

اطلاع روانگی وفد آپ نے وفد کی روانگی کی اطلاع مولانا شوکت علی مرحوم کو بھیج دی اور احتیاطاً مندرجہ ذیل جناب محمد اسماعیل خانصاحب بیرسٹر ایم۔ ایل۔ اے و صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یو۔ پی کو بھی لکھ دیا :-

"مکرم و محترم جناب نواب محمد اسماعیل خانصاحب صدر مسلم لیگ صوبہ یو۔ پی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

گرامی نامہ بہدست جناب وصل صاحب بلگرامی موصول ہوا۔ پڑھکر بہت مسرت ہوئی۔ الحمدللہ! آنجناب نے بھی شرکت علمار کی اہمیت کو محسوس فرمایا۔ حسب مشورہ سامی آج ایک خط مولانا شوکت علی صاحب

کی خدمت میں اس وفد کے قیام وغیرہ کے انتظام کی بابت لکھ دیا گیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ کھانے کا انتظام یہ حضرات خود کریں گے۔ قصہ یہ ہے کہ انشاء اللہ یکم جون کو یہاں سے روانہ ہو کر یہ حضرات ۲ جون کی صبح کو ایکسپریس سے بمبئی پہنچیں گے۔ امید ہے جناب والا اس وفد کی شرکت کے لئے مسٹر محمد علی صاحب جناح اور دیگر اراکین مسلم لیگ سے اس درمیان میں تمام معاملات ضرور طے فرمالیں گے۔ والسلام!

اشرف علی از تھانہ بھون"

ضروری ہدایات مسلم لیگ کے روحِ رواں مسٹر محمد علی جناح سے گفتگو کرنے کے متعلق حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی صاحب امیرِ وفد کو حسبِ ذیل ہدایات دیں:۔

"جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں، وہ میں نے مولانا شبیر احمد کو خط میں لکھ دی ہیں۔ وہ امیر وفد بھی ہیں اور گفتگو کا سلیقہ بھی ان کو بہت بہتر آتا ہے لیکن اگر کسی سے گفتگو کا تم کو اتفاق ہو جائے، تو گفتگو میں اس کا لحاظ رکھنا کہ گفتگو نرم لہجہ میں ہو۔ اختلافی مسائل درمیان میں بالکل نہ آویں۔ اگر مخاطب اختلافی مسائل درمیان میں لانا چاہے تو بہ لطائف الحیل اس سے گریز کرنا اور دوسری گفتگو شروع کر دینا۔ اگر مخاطب کے کسی عمل کے متعلق کچھ تنقید کرنا ہو، تو لہجہ تنقیدی نہ ہو، بلکہ ہمدردانہ اور تبلیغی ہو۔ الفاظ بھی نرم ہوں۔ اور کلموا الناس علیٰ قدرِ عقولھم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جواب ایسا دینا جس کو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے۔ جس کی میں ایک مثال دیتا ہوں کہ میں فتح پور ہسوہ سے الٰہ آباد جا رہا تھا۔ ریل میں کچھ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان ہمسفر ہو گئے۔ مجھے وہ پہچانتے نہ تھے۔ مگر صورت سے مولوی سمجھ کر پوچھنے لگے کہ مولانا شریعت نے کتا پالنا کیوں منع کیا ہے، حالانکہ اس میں بہت سی صفات اچھی ہیں۔ یہ زمانہ وہ تھا جب قومی ہمدردی کا علی گڑھ میں

بہت زور تھا۔ میں اگر ان کے سامنے شرعی مسائل بیان کرتا اور اللہ و رسولؐ کے احکام بیان کرتا، تو بحث کا دروازہ کھل جاتا۔ اور وہ مقصد کہ ان کے دل میں کتے کے پالنے کی برائی بیٹھ جاتے، حاصل نہ ہوتا۔ اس لئے میں نے ان سے کہا کہ کتے میں ساری صفات مسلّم مگر ایک عیب ایسا ہے کہ سب صفات پر پانی پھیر دیتا ہے، انہوں نے کہا کہ مولانا وہ عیب کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں۔ اپنی قوم کے کسی فرد کو دیکھتا ہے تو فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس پر وہ سب نوجوان بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی یہ جنس پاس رکھنے کے قابل نہیں ہے ورنہ ہم میں بھی یہ اثر آوے گا تو یہاں اسکا لحاظ رہے کہ مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ لیکن مخاطب کے فہم کا بھی ضرور لحاظ رہے۔" (از مئیہ ص۳)

یہ ہدایات لے کر مولانا شبیر علی صاحب یکم جون کو دیو بند کے ارادہ سے روانہ ہوئے دوسرے ارکان وفد کو ہمراہ لے کر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت تھانوی کا والا نامہ پیش کیا۔ اتفاق سے مولانا موصوف کی والدہ ماجدہ سخت علیل تھیں جس کے پیش نظر انہوں نے عذر فرمایا۔ مولانا شبیر علی صاحب نے بہت اصرار کیا، مگر مولانا عثمانی والدہ کو اس حالت میں اکیلا چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے۔ جس پر ارکان وفد واپس تھانہ بھون آ گئے اور تمام واقعہ حضرت کی خدمت میں عرض کر دیا۔ جس سے حضرت کو بہت گرانی ہوئی اور یہ فرما کر "بہتر ہے الخیر فی ما وقع" خاموش ہو گئے اور مندرجہ ذیل خط نواب محمد اسماعیل خان صاحب کو لکھ دیا۔

اطلاع التواء "مکرم و محترم جناب نواب محمد اسماعیل خان صاحب زاد فضلکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جناب کو اس سے قبل اطلاع دی گئی تھی کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں ۴ جون کو علماء کا وفد شریک ہوگا اور جناب نے اس کے لئے مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے جملہ ذمہ داری قبول فرمائی تھی۔ مگر اتفاق سے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی

دیوبندی کی والدہ صاحبہ کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کرلی۔ اس لئے مولانا موصوف کی روانگی بھی مشکوک ہوگئی۔ جس کی جناب کو اطلاع دینا ضروری ہے۔ وقت پر تار سے مکرر اطلاع دی جاوے گی کہ وفد روانہ ہوا یا نہیں والسلام

احقر عفی عنہ!

مکرر آنکہ:-

چونکہ وفد کی روانگی قطعی طور سے ملتوی نہیں کی گئی بلکہ احتمال ہے کہ وقت پر روانہ ہوجائے، اس لئے احتیاطاً آپ جملہ انتظامات درست فرمانے میں دریغ نہ فرمادیں۔"

مگر حضرت کو فوری طور پر کوئی ایسا موزوں آدمی نہ مل سکا جو مسٹر جناح سے حضرت کی حسب منشاء گفتگو کرسکتا۔ کیونکہ حضرت تھانوی جانتے تھے کہ مسٹر جناح بقول علامہ سید سلیمان ندوی ؒ۔

"بڑے قانون دان، بڑے مناظر اور اجتماعیات کے بڑے نبض شناس تھے اور اپنے پیروؤں پر بلا کا اثر رکھتے تھے۔ اُن کی بڑی خصوصیت اپنی بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی۔"

(یادِ رفتگاں صد۴۲۲)

اس لئے ان سے گفتگو کرنے کیلئے بھی ایک صاحبِ اثر و تاثیر، موقع شناس اور معاملہ فہم کی ضرورت تھی۔ جس کے بروقت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وفد روانہ نہ ہوسکا۔

دوسرا تبلیغی وفد | اس موقع کے ضائع ہوجانے کے بعد دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہونا قرار پایا۔ جہاں سب ارباب و ارکان لیگ کا اجتماع تھا۔ اس لئے حضرت تھانوی نے اس تاریخی اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک اور تبلیغی وفد مرتب فرمایا، جو مولانا شبیر علی صاحب تھانوی، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا عبدالجبار صاحب ابوہری، مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری اور مولانا معظم حسین صاحب امروہوی پر مشتمل تھا۔ آپ نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کو رئیس الوفد مقرر فرمایا اور بغرض

اخراجات مبلغ دوسو روپیہ اپنی جیب خاص سے مولانا شبیر علی صاحب کے حوالے کئے اور انہیں ہدایت کی کہ وہ سب پٹنہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب وکیل کے ہاں قیام کریں، جو حضرت کے جانثار خادم تھے۔ اس وفد کی آمد کی اطلاع مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو بھی پٹنہ بھیج دی، تاکہ وہ اس کے قیام کا انتظام کر چھوڑیں۔

۲۴ دسمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا شبیر علی صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب اور مولانا عبدالجبار صاحب تھانہ بھون سے روانہ ہوئے۔ مراد آباد میں امروہہ سے آکر مولانا معظم حسین صاحب اور آگے مولانا عبدالغنی صاحب بھی مل گئے۔ احتیاطاً مولانا شبیر علی صاحب نے مراد آباد سے ہی مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو حسب ہدایت حضرت تھانوی تار بھی دے دیا کہ ہم فلاں گاڑی سے آرہے ہیں اگلے روز صبح ۶ بجے یہ وفد پٹنہ پہنچا۔ اسٹیشن پر مولانا عبدالرحمٰن صاحب معہ دیگر حضرات بغرض استقبال موجود تھے اور رئیس الوفد مولانا مرتضیٰ حسن صاحب پہلے ان کے مکان پر پہنچ چکے تھے۔ لیگ کا اجلاس اسی روز سے شروع ہونا تھا۔ مولانا شبیر علی صاحب اپنی "روئیداد" میں لکھتے ہیں کہ :۔

اہتمام ملاقات "ہمارے بعض ساتھیوں نے اجلاس میں شریک ہونا چاہا مگر میں نے عرض کیا کہ ہم اس وقت آزاد نہیں ہیں، بلکہ حضرت کے فرستادہ ہیں۔ جب تک جناح صاحب سے گفتگو نہ ہو چکے اور ہم یہ نہ دیکھ لیں کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ ہم جلسہ میں شرکت نہیں کر سکتے۔ میں ابھی نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب کے پاس گیا اور انہوں نے فوراً جناح صاحب کو اطلاع کی۔ جناح صاحب نے اسی روز شام کے پانچ بجے کا وقت گفتگو دیا۔ لہٰذا میں نے واپس آکر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو اطلاع دی۔ حضرتؒ نے اپنے تالیف شدہ دو رسالے طبع کرا کر ہمارے ساتھ کر دیئے تھے کہ ممبران لیگ کو خصوصیت سے اور جو بچیں وہ عوام میں تقسیم کر دینا۔ ان میں سے ایک رسالہ میں حضرت کا مسلم لیگ کے نام تاریخی پیام تھا۔ جس کی روشنی میں جناح صاحب سے گفتگو کرنا تھی۔ اس لئے میں نے وہ دونوں رسالے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے حوالے کئے اور عرض کیا کہ چونکہ گفتگو آپ کو ہی کرنی ہے، لہٰذا ان

رسالوں کو ملاحظہ فرمالیں تاکہ گفتگو میں آسانی رہے ۔ اس پر مولانا نے گفتگو سے عذر فرمایا۔ اور فرمایا کہ بھائی ان سے گفتگو تم ہی کرنا۔ میں نے عرض کیا کہ اول تو آپ حضرتؒ کی طرف سے امیر الوفد ہیں، پھر ہمارے سب کے بزرگ ہیں اور میرے تو استاد بھی ہیں۔ لہٰذا آپ کے سامنے ہمارا کسی کا بھی گفتگو کرنا اور خاص کر میرا، خلاف قاعدہ ہے اور دوسرے گستاخی بھی ہے ۔ مگر مولانا عذر فرماتے رہے ۔ بڑی خوشامد کے بعد بارہ بجے وہ گفتگو کے لئے راضی ہوتے اور میں دونوں رسالے ان کی خدمت میں پیش کر کے بے فکر ہوگیا۔

شام کو ساڑھے چار بجے گھر سے روانہ ہوتے ۔ ٹھیک پانچ بجے ہم نے جناح صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع کرائی ۔ انہوں نے فوراً بلالیا ۔ جناح صاحب کے کمرہ میں پہنچنے کے لئے کچھ سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ جب سے مجھے نمونیہ ہوا تھا، چلنے سے یا سیڑھی پر چڑھنے سے اب تک بھی میرا سانس پھول جاتا تھا۔ جس سے فوراً گفتگو کرنا بھی مشکل ہوتا ۔ جب نصف سیڑھیاں طے کرلیں اور میرا سانس کافی پھول رہا تھا، تو اس وقت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ بھیا! تو گفتگو کر یا نہ کر، میں تو گفتگو نہ کروں گا ۔ اب ادھر تو یہ جلدی کہ جناح صاحب ہمارے منتظر بیٹھے ہیں اور ادھر میرے اوپر یہ بم گرا ۔ میں نے ہر چند عرض کیا کہ حضرت میری حالت تو دیکھئے ۔ میں گفتگو کے قابل کہاں ہوں ۔ پھر نہ گفتگو کا اسلوب سوچا نہ کچھ ۔ آخر میں کیسے گفتگو کر سکتا ہوں ۔ لیکن مولانا نے نہ مانا۔ آخر طوعاً و کرہاً میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا یوں ہی سہی ۔

قائدِ اعظم سے وفد کی پہلی ملاقات

چنانچہ ہم سب اوپر پہنچے ۔ جناح صاحب کرسی پر تشریف فرما تھے ۔ ہم کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے ۔ سب سے مصافحہ فرمایا ۔ عبدالعزیز صاحب بیرسٹر پٹنہ نے، جن کے جناح صاحب مہمان تھے، ہمارا سب کا تعارف کرایا ۔ سب بیٹھ گئے اور گفتگو شروع ہوگئی جو میں نے حضرت کی ہدایات کے مطابق کی ۔ یہ گفتگو قریباً ایک گھنٹہ جاری رہی ۔ جناح صاحب نے نہ یہ کہ جوابات تسلی بخش عنایت فرمائے، بلکہ ان کے جوابات ایسے تھے کہ ہم سب اور خصوصیت سے میں تو بہت متاثر ہوا ۔ کیونکہ اگر دورانِ گفتگو

میں ان کے کسی دینی عمل کی کوتاہی کے متعلق عرض کیا گیا، تو بغیر کسی تاویل یا حجت کے انہوں نے اپنی کوتاہی کو تسلیم کیا اور آئندہ اس عمل کی اصلاح کا وعدہ کیا اور ہم سے کہا کہ آپ بھی دُعا کریں کہ میں اپنی اصلاح کرسکوں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہم سب تو جناح صاحب کو کیا متاثر کرسکتے تھے۔ اور میری تو خصوصیت سے کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ نہ دینی، نہ دنیوی۔ یہ صرف حضرت کا وہ روحانی فیض کام کر رہا تھا جو حضرت کی توجہ سے پہنچ رہا تھا۔ اور جناح صاحب بھی حضرت کے فرستادہ وفد سے متاثر تھے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ جناح صاحب کسی بڑے سے بڑے کا اثر بھی قبول کرنے والے نہ تھے۔"

تبلیغ نماز

اس ایک گھنٹہ کی گفتگو میں بہت سے مذہبی امور زیرِ بحث آئے جن میں سے ایک امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس نے قائدِ اعظم کے حالات وخیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اپنی اس اولین ملاقات کی تفصیل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بدورانِ گفتگو میں نے جناح صاحب سے یہ سوال کیا کہ آپ ہزاروں روپیہ خرچ کراکے پنڈال وغیرہ بنواتے ہیں اور لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں۔ اس میں کیا نفع ہے؟ جناح صاحب نے فرمایا کہ اس سے غیر اقوام پر رعب پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایک اور تدبیر بتادوں، جس سے رعب زیادہ ہوگا۔ فرمایا کہ وہ کیا؟ میں نے کہا کہ جب دورانِ جلسہ میں نماز کا وقت آجائے تو اس سوا ڈیڑھ لاکھ کے مجمع کو لے کر باجماعت نماز ادا کریں پھر آپ خود دیکھیں گے کہ کتنا رعب پڑتا ہے۔ اس پر جناح صاحب نے فوراً فرمایا کہ آپ فرماتے تو صحیح ہیں مگر میں اس وقت اس پر عمل کرنے سے معذور ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کو کیا عذر ہے؟ تو فرمایا کہ آپ باجماعت نماز پڑھنے کو کہتے ہیں، تو امام کس کو بناؤں۔ ممکن ہے کہ میرا خیال صحیح ہو کہ اگر میں امامت کروں، سب لوگ نہیں تو بہت بڑی اکثریت میرے پیچھے نماز

پڑھے مگر میں امامت کے قابل نہیں۔ مجھ میں اس کی اہلیت نہیں اسلئے کسی دوسرے کو امام بنانا پڑے گا۔ اگر امام دیوبندی ہو گا۔ تو بریلوی اس کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے۔ اگر بریلوی ہو گا تو دیوبندی نہ پڑھیں گے اور الگ جماعتوں سے بجائے رعب پڑنے کے غیر اقوام کو مسلمانوں کا اختلاف نمایاں ہو گا۔ اب تو اپنی اپنی مسجدوں میں پڑھتے ہیں۔ اور یہاں اگر کئی جماعتیں ہوئیں، تو یہ زیادہ نمایاں ہو گا۔ اس لئے میں اس وقت تو معذور ہوں، آگے چل کر دیکھا جائے گا۔

میں نے کہا کہ اس پر تو بحث طویل ہو جائے گی کہ یہ عذر صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق تو پھر کسی ملاقات میں عرض کروں گا۔ اب دوسری بات عرض کرتا ہوں کہ خود آپ پر بھی تو نماز فرض ہے۔ آپ کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ جلسوں میں اپنا یہ معمول رکھیں کہ جب نماز کا وقت آوے، مصلیٰ بچھا کر آپ نیت باندھ لیں اور کوئی پڑھے یا نہ پڑھے۔

یہاں تک تو میں نے جناح صاحب کی گفتگو نقل کی ہے۔ الفاظ میرے ہیں بات اُن کی ہے۔ آگے مندرجہ بالا سوال کا جواب جناح صاحب نے جو دیا۔ اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ جن کو سن کر مجھے تو پسینہ آگیا تھا کہ ایک بے عمل مگر اتنا بڑا آدمی یوں مجمع کے سامنے اقرار خطا کرے، بڑی بات ہے۔ ہم جیسوں سے اس قسم کا سوال ہوتا تو شاید تاویل ہی کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت کرے (آمین) کہ وہ کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ میری بات سن کر وہ آگے کو جھک گئے اور نہایت ندامت کے لہجہ میں یہ الفاظ فرماتے:۔

"میں گنہگار ہوں، خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں۔ میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔"

چونکہ اس کمرہ میں ہمارے (ارکانِ وفد) کے علاوہ بارہ تیرہ اور حضرات بھی

موجود تھے۔ جن میں سے مولوی منفعت علی صاحب وکیل سہارنپوری، مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل پٹنہ، مسٹر عبدالعزیز صاحب بیرسٹر پٹنہ کو جانتا تھا۔ باقی حضرات سے میں واقف نہ تھا۔ ان سب کے سامنے ان الفاظ سے بغیر کسی تاویل کے اظہارِ ندامت اور اقرارِ اصلاح نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس تاویل سے فوراً سنبھل کر میں نے کہا کہ دیکھئے! یہ وعدہ جناح صاحب کا ہے، کسی چلتے پھرتے آدمی کا نہیں۔ اس وعدہ کو پورا فرمایا جاوے۔ اس پر مرحوم سیدھے ہو کر تن گئے اور بار بار سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ:-

"جناح کا وعدہ! جناح کا وعدہ!! میں اس کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ میرے لئے دُعا کریں۔"

(مشاہدات و واردات صـ۱۱۴ تا صـ۱۱۸)

غرض کہ یہ وہ حالات تھے۔ جن کے تحت قائدِ اعظم نے نماز شروع کی۔ جو آخیر وقت تک اہلِ سنت کے طریقہ پر پڑھتے رہے اور ان کی دیکھا دیکھی بعض بے نماز بھی نماز کے عادی بن گئے۔ اس واقعہ کو جب مولا کریم کے اس فرمان کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے کہ:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ۔

ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے وہ لوگ اپنے رب پر توکل اور نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

تو ان کے مومن کامل ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کیا عجب کہ طالبِ پاکستان کا اقرارِ گناہ کے بعد اس بے نیاز کے آستانِ کبریائی پر سرِ نیاز جھکا دینے کا ثمرہ "پاکستان" ہی ہو۔

دوسری ملاقات اس کے بعد حضرت تھانوی نے قائدِ اعظم کے قول و کردار کا گہری نظر سے مطالعہ شروع کر دیا۔ آپ ان میں جب بھی کوئی بات خلاف شریعت دیکھتے۔ اس کی اصلاح کے لئے قائدِ اعظم کے پاس فوراً وفد بھیجتے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے بعد قائدِ اعظم نے جو تقاریر کیں، ان سے مذہب اور سیاست کے متعلق ان کا نظریہ واضح ہو گیا کہ وہ بھی اہلِ مغرب کی طرح مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہیں اور الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ :-

"جناح صاحب کی تقریروں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ اس کی بابت ان کو سمجھانا ہے"

(روئیدادِ تبلیغ ص۶)

چنانچہ مولانا شبیر علی صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ ان کی درخواست پر حضرت نے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان) کو ان کے ساتھ کر دیا۔ تین حضرات کا یہ وفد ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی پہنچا۔ مولانا شبیر علی صاحب نے قائدِ اعظم سے ٹیلیفون پر اپنا تعارف کرایا کہ :-

"ہم وہی ہیں جو پٹنہ میں نیاز حاصل کر چکے ہیں۔ اب بھی ہم کو وقت دیا جائے"

قائدِ اعظم نے انہیں شام کے سات بجے کا وقت دیا۔ اور یہ سب حضرات ٹھیک وقت مقررہ پر ان کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنی آمد کے مقصد سے انہیں آگاہ کیا :-

مذہب و سیاست چنانچہ مذہب و سیاست پر افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا بیان ہے کہ :-

"وفد نے قائدِ اعظم سے کہا کہ مسلمان کسی تحریک میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس تحریک کو شریعت کے

مطابق نہ چلائیں۔ اس تحریک کے چلانے والے خود کو احکامِ اسلام کا نمونہ نہ بنائیں۔ اور ان کے پیرو شعائرِ اسلام کی پابندی نہ کریں۔ کیونکہ جب یہ سب خود کو احکامِ دین کا پابند بنالیں گے، تو اس کی برکت سے نصرت و کامیابی خود بخود ان کے قدم چومے گی اور ان شاء اللہ بہت جلد کامیابی نصیب ہوگی۔

وفد نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی سیاست کبھی مذہب سے الگ نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائد مسجدوں کے امام بھی تھے اور میدان کے جرنیل بھی۔ خلفائے راشدین، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ سب مذہب و سیاست کے جامع تھے۔

قائدِ اعظم نے فرمایا کہ میرا تو خیال یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیئے۔ وفد نے کہا کہ پھر اس طرح کامیابی کی توقع نہیں۔"

غرض کہ اس موضوع پر پورے اڑھائی گھنٹے گفتگو ہوتی رہی اور بالآخر یہ خانقاہ نشین علماءِ دین کے اس بہت بڑے اور کامیاب سیاستدان کی سیاست کو مذہب کی حدود کے اندر لانے میں کامیاب ہوگئے اور قائدِ اعظم نے وفد کی معروضات کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنے اس تاریخی فیصلہ سے آگاہ فرمایا کہ :-

"دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو، میری سمجھ میں اب خوب آگیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے۔" (روئیداد ص۷)

تبلیغی ملاقاتیں

اسی طرح دربارِ اشرفیہ کے مبلغین اور قائدِ اعظم کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ جب بھی کسی دینی معاملہ میں حضرت تھانوی قائدِ اعظم کی رہنمائی ضروری سمجھتے، فوراً ان کی خدمت میں اپنا سفیر بھیجتے۔ دہلی کی دوسری ملاقات میں مولانا شبیر علی

صاحب اپنے ساتھ پھر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو ہمراہ لے گئے۔ مگر تیسری ملاقات کے وقت مفتی صاحب کو بھی کوئی عذر پیش آگیا۔ جس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا شبیر علی صاحب سے فرمایا کہ:۔

"تم ہر مرتبہ کسی نہ کسی کو ساتھ لے جانے کی کیوں کوشش کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ معاملہ تبلیغ احکام کا ہے۔ مجھے اپنے اوپر اطمینان نہیں۔ میں ساتھیوں سے کہہ دیتا ہوں کہ گفتگو تو میں ہی کروں گا۔ اگر دورانِ گفتگو میں میری زبان سے کوئی غلط بات نکلے تو بلا لحاظ اس کے کہ میری کچھ ہتک جناح صاحب کے سامنے ہوگی۔ مجھے فوراً متنبہ فرما دیں۔ اس لئے وہ حضرات تو بالکل خاموش تشریف رکھتے ہیں۔ مگر مجھے اطمینان رہتا ہے کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی تو ساتھی متنبہ فرما دیں گے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ اجی نہیں!! اس کی فکر مت کرو۔ ہر مرتبہ ساتھی کی تلاش میں دقت ہوتی ہے۔ اللہ کا نام لے کر جاؤ، اللہ مددگار ہے" (روئیداد ص۷)

سفیرِ اشرف

چنانچہ اس کے بعد ہمیشہ دربارِ اشرفیہ کی طرف سے مولانا شبیر علی صاحب ہی اکیلے بطور سفیرِ تبلیغ قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ مولانا کے لئے قائدِ اعظم نے ملاقات کا وقت اور مقام مستقل طور پر مقرر کر رکھا تھا۔ مولانا جب بھی دہلی جاتے اور ملاقات کے لئے ٹیلیفون کرتے، خواہ اس وقت کتنے ہی کیوں نہ بجے ہوں۔ انہیں شام کے سات بجے کا ہی وقت بغرضِ ملاقات دیا جاتا۔ پٹنہ کی ملاقات کے بعد مولانا موصوف نے قائدِ اعظم کے ساتھ جس قدر ملاقاتیں کیں، سب کی سب اسی وقت ہوئیں اور کوئی ملاقات اڑھائی گھنٹے سے کم اور تین گھنٹے سے زائد عرصہ تک نہیں رہی۔ مولانا بھی ماشاء اللہ اصولوں کے بادشاہ کے سفیر تھے اور بذاتِ خود بھی بڑے بااصول! اس لئے وہ ٹھیک سات بجے ہی اپنے مخصوص کمرۂ ملاقات میں قدم رکھتے، جو قائدِ اعظم کی کوٹھی کے برآمدہ کے سرے پر واقع تھا۔ دوسرے ملاقاتیوں سے تو قائدِ اعظم ڈرائنگ روم میں گفتگو فرمایا

کرتے تھے۔ مگر سفیر اشرفیہ کے لئے ایک خاص امتیاز و اعزاز کے لئے یہ آراستہ کمرہ مخصوص تھا۔ جس میں اور کسی کو شرفِ ملاقات نہ بخشا جاتا تھا۔ اگر اتفاق سے مولانا چند منٹ پہلے پہنچ جاتے، تو اتنا عرصہ کوٹھی کے باہر ہی ٹہل کر گذار لیتے۔ کوٹھی کے اندر وقت مقررہ سے پہلے قدم نہ رکھتے۔ اور قائدِ اعظم جو ان کی انتظار میں تیار بیٹھے ہوتے، مولانا کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی فوراً بعد پہنچ جاتے۔

اعترافِ قائدِ اعظم حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی صاحب کو کبھی سیاسیات پر گفتگو کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ کیونکہ سیاسیات کے تو وہ خود ماہر تھے۔ ان میں جو کمی تھی، وہ صرف تدین کی تھی۔ جسے پیدا کرنے کے لئے تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری کیا گیا تھا۔ اس لئے مولانا نے قائدِ اعظم سے جس قدر ملاقاتیں کیں، سب میں مذہبی امور ہی زیرِ بحث لائے اور سیاسیات پر کبھی گفتگو نہ فرمائی۔ چنانچہ مولانا شبیر علی صاحب اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ :-

"ایک مرتبہ میں حسب ارشاد حضرتِ والا حاضر ہوا۔ وہی شام کے سات بجے تھے ابھی جانبین سے مزاج پرسی ہی ہو رہی تھی کہ موٹر کی باہر سے آواز آئی اور ملازم نے آکر اطلاع دی کہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں تو یہ سمجھا کہ آج کی مجلس ختم ہوئی۔ اب کوئی اور وقت لے لوں گا مگر جناح صاحب نے پیشانی پر بل سا ڈال کر ملازم سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو بٹھا دو اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ جی فرمائیے! میں نے جو کچھ عرض کرنا تھا، شروع کر دیا اور جناح صاحب نے اس پر بحث شروع فرمادی۔ یہ محض حضرت کی توجہ کا اثر تھا کہ مجھ جیسا بے بضاعت آدمی ان کی بحث کا تسلی بخش اور ان کے فہم کے مطابق جواب عرض کر سکتا تھا۔ یہ بحث بھی ان ہی الفاظ پر ختم ہوئی کہ :

"ہاں میری غلطی تھی۔ اب میری سمجھ میں آگیا۔"

رات کے دس بجے یہ مجلس ختم ہوئی۔ میں اجازت لے کر کھڑا ہوا۔ اور میں

نے عرض کیا کہ آپ کا وقت تو ہمیشہ لیتا رہتا ہوں ۔ مگر آج میری وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو انتظار کی بہت تکلیف ہوئی ۔ اس پر قائداعظم نے فرمایا کہ،

"نہ نہ : آپ اس کا ہرگز خیال نہ کریں ۔ ڈاکٹر صاحب سے ہر وقت بات ہوتی رہتی ہے اور اس وقت بھی وہ جس کام کے لئے آتے ہیں ، مجھے معلوم ہے ۔ مگر آپ تو کبھی تشریف لاتے ہیں اور حضرت تھانوی کی باتیں مجھے سمجھاتے ہیں ۔ علماء میرے پاس بہت آئے مگر سب مجھ سے موجودہ سیاست میں بات کرتے ہیں جس سے وہ حضرات ناواقف ہیں ۔ اور میں مذہب سے ناواقف ہوں ۔ حضرت تھانوی نے آپ کو ایک مرتبہ بھی کسی سیاسی امر میں گفتگو کے لئے نہیں بھیجا ۔ مجھے آپ کے ذریعہ خاص مذہبی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو اور جگہ نصیب نہیں ہوتیں ۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو تو بیٹھ جائیے ۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے ۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا"

میں نے عرض کیا کہ آج تو مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا ، عرض کر چکا ۔ آپ کے اس دینی شوق میں اللہ تعالےٰ ترقی دے ۔ اب پھر جب حضرت کا حکم ہو گا ۔ حاضر ہوں گا ۔ فرمایا کہ اچھا یہ آپ کی مرضی اور میں چلا آیا "

(روئیداد صہ ۸،۹)

اعتمادِ قائدِاعظم | مولانا موصوف اور قائداعظم کی گفتگو نہایت بے تکلفانہ ماحول میں ہوتی ۔ اور اگر کبھی موقع پیدا ہوتا ، تو ایک دوسرے سے مزاحِ لطیف کا تبادلہ بھی کر لیتے ۔ جیسا کہ مولانا کی اس تحریر سے ظاہر ہے کہ :-

" ایک روز دورانِ گفتگو میں میں نے عرض کیا کہ جناح صاحب ! ہم انگریزی سیاست سے ناواقف ہیں ۔ اس لئے ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں ۔ آپ انگریزی کے تھپیڑ مارنے کو کہتے ہیں ! ہم تھپیڑ مارتے ہیں ۔ آپ گھونسہ مارنے کو کہتے ہیں ہم گھونسہ

ہار جیتے ہیں۔ غرض اس معاملہ میں ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں اور جتنے ہم سیاست سے ناواقف ہیں، شاید اس سے کچھ زیادہ یا اتنے ہی آپ مذہب سے ناواقف ہیں۔ تو جس طرح ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں، مذہبی معاملات میں آپ کو بھی ہماری تقلید کرنا چاہیئے۔ اس پہ فرمایا کہ اس وقت دنیا میں کتنے لیڈر ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جتنے برسات میں مینڈک! قائدِ اعظم بہت ہنسے اور فرمایا کہ یہ صحیح ہے۔ پھر فرمایا کہ آپ ہر لیڈر کا کہا مانتے ہیں؟ میں نے کہا نہیں! ایسی تقلید میں اعتماد شرط ہے۔ فرمایا:-

"بس! اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں بے چوں و چرا آپ کا کہا مانوں تو میں تیار ہوں۔ آج تک تو میں آپ سے سمجھنے کے لئے بحث بھی کیا کرتا تھا، لیکن آج کے بعد میں خاموش بیٹھ کر سنوں گا۔ اور مذہبی معاملات میں جو ہدایات آپ دیں گے، اُن کو تسلیم کروں گا۔ کیونکہ مجھے حضرت تھانوی پر پورا پورا اعتماد ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کا پایہ بہت بلند ہے اور ان کی رائے درست ہوتی ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ جزاکم اللہ! میرا مقصد بھی حضرت ہی کی رائے ماننے سے ہے۔ لیکن آپ بحث ضرور کر لیا کریں کہ اس طرح بات سمجھ میں آنے کے بعد پختہ ہو جاتی ہے۔ مگر یہ ممکن ہے کہ میری کوتاہی تقریر سے کسی وقت کوئی بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے اور اس وقت میں یہ عرض کروں کہ اگرچہ میں آپ کو سمجھا نہیں سکا۔ لیکن مسئلہ یہی ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ سن کر فرمایا کہ "ضرور ایسا ہی ہوگا"

(روئیداد صفحہ ۹)

تبلیغی خطوط

قائدِ اعظم کی خدمت میں تبلیغی وفود بھیجنے کے علاوہ وقتاً فوقتاً حضرت تھانوی انہیں تبلیغی خطوط بھی لکھتے رہے۔ چنانچہ "اعلام نافع" میں درج ہے کہ:

"میں خود اس (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ چنانچہ

عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اسی کام کے لئے بھیجا۔ پھر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اسی کام کے لئے دہلی روانہ کیا۔ غرض جتنا مجھ سے ہوسکتا ہے، لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً علماء بھی مل کر ان پر زور دیتے اور ان کو نماز، روزہ، وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے۔ تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی"۔
(افادات اشرفیہ درمسائل سیاسیہ صہ۸۶)

علاوہ ازیں "افاداتِ اشرفیہ درمسائل سیاسیہ" صہ۹۶ پر حضرت تھانوی کا ایک ملفوظ نقل کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"جس زمانہ میں کانگرس مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امورِ دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے اس لئے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں، بلکہ علمائے محققین سے پوچھ کر عمل فرمائیں۔ تو انہوں نے نہایت شرافت اور تہذیب سے جواب لکھا اور اطمینان دلایا کہ اسی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا"۔

قائدِ اعظم چونکہ فطرتِ سلیم کے مالک تھے اور حضرت تھانوی کی تبلیغ سے بہت زیادہ متأثر تھے، اس لئے وہ حضرت کی ہدایات کو بڑی مسرّت کے ساتھ قبول فرماتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی موجودگی میں قائدِ اعظم کا ایک گرامی نامہ انگریزی میں آیا۔ اس میں درج تھا کہ:۔

"آپ کا والا نامہ ملا۔ بڑی مسرت ہوئی۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں میں آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ آئندہ بھی آپ مجھے ہدایت فرماتے رہیں"۔

حضرت تھانوی کے خطوط تو اردو میں ہوتے تھے، مگر خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ان کا انگریزی ترجمہ کرکے اصل خط کے ساتھ منسلک کر دیتے تھے تاکہ انہیں سمجھنے میں آسانی ہو اور اس تمام خط و کتابت کا ریکارڈ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی محفوظ رکھتے تھے۔

سعیِ اشاعت

۱۹۴۷ء میں جب کہ راقم حضرت تھانوی کی یادگار میں رسالہ "پیغام اسلام" شائع کرنے والا تھا۔ راقم نے مولانا شبیر علی صاحب سے اس تاریخی خط و کتابت کا بغرضِ اشاعت مطالبہ کیا تو انہوں نے لکھا کہ یہ خط و کتابت جانبین کی اجازت کے بغیر شائع نہیں کی جاسکتی۔ حضرتؒ تو موجود نہیں، مگر قائدِاعظم کی اجازت لینی ضروری ہے۔ ان سے اجازت لینے کے بعد ہی اس کی اشاعت کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ انہیں ۲۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو بذریعہ چٹھی نمبر ۱۰۵ قائدِاعظم سے اجازت حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا تو انہوں نے جواباً لکھا کہ:۔

"مخدومی! السلام علیکم!

میرا قصد وسط مئی میں دہلی جاکر قائدِاعظم سے ملنے کا ہے۔ انشاءاللہ خطوط کی نسبت اسی وقت ان سے دریافت کر لوں گا۔ اگر ممکن ہو، تو ایک خط بطور یاددہانی ایسے وقت روانہ فرمادیں کہ مجھے ۱۲ یا ۱۳ مئی کو مل جائے تاکہ یاد تازہ ہو جائے۔ والسلام۔

احقر شبیر علی از تھانہ بھون"

بعدازاں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان کو یاددہانی نہ کرائی جاسکی۔ پاکستان بن گیا۔ قائدِاعظم فردوسِ بریں کو سدھار گئے۔ مولانا شبیر علی صاحب بھی ہجرت کرکے پاکستان تشریف لے آئے۔ اس وقت دوبارہ انہیں اس خط و کتابت کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ کیونکہ اب کسی کی اجازت کی ضرورت نہ تھی مگر بدقسمتی سے وہ یہ خط و کتابت ہندوستان میں ہی چھوڑ آئے تھے، جس کے منگانے کے لئے ایک ترکیب نکالی گئی اور مولانا شبیر علی صاحب نے تھانہ بھون لکھ دیا اور احتیاطاً یہ مشورہ دیا کہ:۔

قائدِ اعظم کی فائل

"میں نے آج تھانہ بھون خط لکھ دیا ہے۔ اگر وہ خطوط محفوظ ہوئے تو آجاویں گے۔ حضرت کی وفات کے بعد بمبئی سے پانچ حضرات[1] بطور تعزیت تھانہ بھون آئے تھے۔ انہوں نے ذکر کیا تھا کہ ہم لوگ کچھ تبلیغ کے سلسلہ میں قائدِ اعظم صاحب کے پاس گئے تھے۔ دورانِ گفتگو میں قائدِ اعظم نے بڑے جوش سے فرمایا کہ اس قریب زمانہ میں ہندوستان میں سب سے بڑا عالم کون گذرا ہے؟ یہ پانچوں حضرات کہنے لگے کہ ہمارے ذہن میں حضرتؒ تھے، مگر ہم نے سوچا کہ نہ معلوم ان کے ذہن میں کون ہے۔ اس لئے ہم نے قائدِ اعظم سے ہی دریافت کیا کہ آپ ہی بتلایئے؟ اس پر قائدِ اعظم اٹھ کر دوسرے کمرہ میں گئے اور ایک فائل لاکر کھول کر دکھلا کہ آپ لوگ پہچانتے ہیں کہ یہ تحریر کس کی ہے؟ ہم سب نے حضرتؒ کی تحریر پہچان کر کہا کہ یہ تحریر تو حضرت تھانوی کی ہے۔ اس پر قائدِ اعظم نے بڑے جوش سے کہا کہ ہاں! اور یہی شخص اس زمانہ کا سب سے بڑا عالم گذرا ہے اور بہت سے کلمات حضرت کی تعریف میں کہے۔ اس قصہ کو نقل کرنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ شاید وہ فائل فاطمہ جناح کے پاس ہو۔ اگر کوئی سبیل ہو تو ان سے بھی تحقیق کر لی جاوے۔ تھانہ بھون سے خطوط آگئے، تو میں پیش کر دوں گا۔" (مکتوب گرامی مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۴ء)

چنانچہ اس سلسلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کو ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء اور دوبارہ بطور یاددہانی ۲۲ فروری ۱۹۵۵ء کو دو انگریزی ٹائپ شدہ چٹھیاں بذریعہ رجسٹری بواپسی رسید لکھی گئیں۔ جن کی خود محترمہ فاطمہ جناح کی قلمی رسید وصولی موجود ہے، مگر انہوں نے ان کا جواب تک نہ دیا۔ حالانکہ ان کے برادرِ مکرم قائدِ اعظم بقول حضرت تھانوی خطوط کا جواب بہت جلد دیتے تھے۔

ادھر تھانہ بھون سے بھی خطوط کے بارہ میں جو جواب آیا، اس کے متعلق مولانا شبیر علی

---

[1] یہ حضرات مجلسِ دعوت الحق بمبئی کے ممبر تھے جو حضرت کی تحریک پر اربابِ مسلم لیگ کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً تبلیغ کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔

صاحب نے یوں مطلع فرمایا کہ :-

"قائدِاعظم کے خطوط کی بابت ہندوستان سے مایوس کن جواب آیا ہے جس کی تفصیل معلوم کرکے میری طرح آپ کو بھی صدمہ ہوگا۔ اس لئے صرف یہی اطلاع کافی ہے"

تصدیقِ صدیق | باغپت ضلع میرٹھ کے رئیس اعظم نواب جمشید علی خاں صاحب بڑے صاحبِ علم و ذوق بزرگ ہیں۔ اپنے علاقہ میں اپنے اخلاص و ایثار کی وجہ سے اتنے ہر دلعزیز کہ متواتر تیس برس یو۔ پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے۔ حضرت تھانوی کے مریدانِ خاص میں سے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کو نواب صاحب سے کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ نواب صاحب جب پہلی مرتبہ دربارِ اشرفیہ میں حاضر ہوتے تو انہوں نے اپنی تسلی کے لئے حضرت پر بہت سے سوالات کئے جن کے جوابات نے نواب صاحب کو حضرت کے حلقہ مریدین میں شمولیت پر مجبور کردیا۔ وہ سوالات چونکہ بہت اہم نوعیت کے تھے۔ اس لئے جناب وصل بلگرامیؒ ان کے جوابات قلمبند کرتے گئے۔ تو آپ نے اس مجموعہ ملفوظات کا نام غایت شفقت سے نواب صاحب کے نام کی رعایت سے "بزمِ جمشید" رکھا جو یہ مجموعہ کئی بار چھپ چکا ہے۔

نواب صاحب موصوف کے صدق و اخلاص سے قائدِاعظم بڑے متاثر تھے۔ وہ انہیں "یارِ غار" تصور کرتے تھے اور عموماً موسم سرما میں اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کے ہمراہ آرام کرنے کے لئے نواب صاحب کے ہاں باغپت تشریف لے جایا کرتے تھے اور ہفتوں وہاں رہتے تھے۔ وہاں اکثر حضرت تھانوی کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ نواب صاحب انہیں حضرت کے ملفوظات وغیرہ بھی سنایا کرتے تھے، جن میں قائدِاعظم بڑی دلچسپی لیتے تھے اور حضرت کے متعلق ان کے دل میں غائبانہ محبت و عظمت پیدا ہوگئی تھی۔

مولانا شبیر علی صاحب بطور سفیر دربارِ اشرفیہ قائدِاعظم کو جو تبلیغ کرتے رہے، اس کے متعلق نواب صاحب اپنے مکتوب مورخہ ۴ اپریل ۱۹۵۵ء میں لکھتے ہیں :-

جامِ جمشید ”یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائدِاعظم کی تمام تر دینی تربیت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان تھا اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا کی بدولت تھا۔ مولوی شبیر علی صاحب تھانوی نے قائدِاعظم کو حضرت والا کے قریب تر لانے میں بڑا کام کیا۔

ایک مرتبہ قائدِاعظم کے ایما سے نواب اسماعیل خاں صاحب[۱] میرے ساتھ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند اہم سیاسی مسائل پر گفتگو کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی شفقت سے تمام گفتگو سماعت فرمائی اور ہر سوال کا ایسا مکمل جواب مرحمت فرمایا کہ نواب اسماعیل خاں صاحب انگشت بدنداں تھے۔ کہنے لگے کہ مجھے علم نہیں تھا کہ یہ بوریا نشین نہایت خاموش زندگی بسر کرنے کے باوجود سیاسیات میں ایسی بصیرت رکھتے ہیں اور ہر مسئلہ پر کس قدر عبور ہے۔ یہ ملاقات نواب اسماعیل خاں صاحب کی خواہش پر حضرت والا سے میں نے ہی طے کرائی تھی۔ نواب صاحب آج تک بطور اظہارِ تشکر فرمایا کرتے ہیں کہ تیری بدولت مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی۔

قائدِاعظم باغپت کے دوران قیام میں حضرت والا کا بہت خلوص اور ادب سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قائدِاعظم کو تھانہ بھون حاضر ہونے کا انتہائی شوق تھا۔ لیکن افسوس کہ چند در چند وجوہات کی بناء پر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

قائدِاعظم پر آخر زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا اور جس کو ہم سب نے دیکھا، وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہی جوتیوں کا صدقہ تھا۔

میرے ایک ملازم جن کا نام حاجی بندو ہے، مجھے بہت عزیز ہیں۔ دو تین پشتوں سے ان کا میرے خاندان سے تعلق ہے۔ حضرت کے بھی بہت محبوب مرید ہیں۔ میاں بندو ان خوش نصیبوں میں سے ہیں۔ جن کو آخری لمحات تک حضرت والا کی خدمت کا موقع نصیب

---

[۱] دہلی کے مشہور رئیس نواب مصطفےٰ خان صاحب شیفتہ کے پوتے، بیرسٹر، ایم۔ ایل۔ اے، صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ۔ یو۔ پی۔

ہوا۔ حضرت پیرانی صاحبہ مدظلہا نے مجھے لکھا تھا کہ اگر ممکن ہو، تو حاجی بندو کو بیماری کے زمانہ میں حضرت والا کی خدمت کے لئے تھانہ بھون بھیج دیا جائے۔

ایک خط میاں بندو کے پاس محفوظ تھا، جس کی نقل روانہ کرتا ہوں۔ یہ خط اس موضوع سے بہت متعلق ہے، جو زیرِ تحریر ہے۔ نیاز مند جمشید!"

مقامِ حاجی بندو نواب صاحب موصوف کے خادم خاص حاجی بندو صاحب اُن خوش نصیب خدام میں سے ہیں۔ جو ایک طرف تو اپنے آقا کو "بہت عزیز" ہیں اور دوسری طرف اپنے آقا کے شیخ حضرت تھانوی کو "بہت محبوب" ہیں۔ گویا کہ وہ نواب صاحب کے خادم خاص ہی نہیں، ان کے پیر بھائی بھی ہیں۔ جن کا ذکرِ خیر مورخِ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی اپنی کتاب "یادِ رفتگاں" میں ان حسرت بھرے الفاظ میں کرتے ہیں کہ حضرت تھانوی کے آخری ایام میں:۔

"خدمت اور خاص کر رات کے وقت نوبت بہ نوبت جاگ کر خدمت کی سعادت خدامِ خاص کی قسمت میں آئی۔ جن میں پہلا درجہ خواجہ (عزیز الحسن) صاحب کا ہے ان کے علاوہ مولانا جلیل احمد صاحب، بندو میاں ملازم نواب صاحب باغپت اور مولوی شبلی صاحب جونپوری نے اس خدمتِ خاص کی سعادت، آخیر تک پائی۔ بعد کو مولانا ظفر احمد صاحب بھی ڈھاکہ سے آکر اس میں شامل ہوگئے۔" (یادِ رفتگاں ص۲۹۱)

قائدِ اعظم اور حاجی بندو یہ حاجی بندو صاحب ۲۰ راپریل ۱۹۴۳ء کو قائدِ اعظم کے متعلق حسب ذیل خط حضرت تھانوی کی خدمت میں لکھتے ہیں:۔

"از جانب بندو باغپتی!

حضور اقدس مدظلہ العالی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

غلام حضور والا کی خیریت چاہتا ہے۔ بڑی پیرانی صاحبہ اور چھوٹی پیرانی صاحبہ کی بھی خیریت چاہتا ہے۔ جناب قائدِاعظم محمد علی جناح معہ اپنی ہمشیرہ کے بانپت نواب صاحب کے مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ چار روز قیام رہا چلتے وقت مجھے بلایا اور کہا کہ خدا نے مجھے بہت دے رکھا ہے۔ میں تمہارے بال بچوں کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ فقط محمد علی جناح ہوتے تو میں لے لیتا۔ مگر آپ تو ہمارے قائدِاعظم ہیں، اس لئے معافی چاہتا ہوں میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ اپنے قائدِاعظم کو کچھ نذر پیش کروں، لیکن اتنی وسعت نہیں ہے۔

حضرت والا کے غلام کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ حضرت والا غلام کے پاس ہیں میرے دل سے جو آواز نکل رہی تھی، غلام کو یقین ہے کہ حضرت والا ہی بول رہے تھے۔ دونوں بہن بھائی ادب سے نیچے نظر کئے ہوئے میری بات سن رہے تھے۔ یہ حضرت والا کا ہی ادب تھا۔ میں نے کہا کہ انشاء اللہ تعالےٰ میں حضرت والا سے آپ کی تعریف کروں گا۔ کہنے لگے، مولانا تھانوی سے؟ میں نے کہا، جی ہاں! فرمانے لگے کہ تمہارے اندر مسلمانوں کا درد ہے۔ چار دن جو تم نے ہماری خدمت کی، اس سے اندازہ ہو گیا۔ اسی وقت نواب صاحب تشریف لے آئے۔ نواب صاحب سے بہت دیر تک کمرہ میں باتیں کرتے رہے۔

موٹر میں سوار ہونے سے پہلے میرے پاس آئے۔ کہا السلام علیکم اور مصافحہ کیا اور دہلی چلے گئے۔ نواب صاحب فرمانے لگے کہ جب قائدِاعظم نے تمہاری تقریر کو مجھے دہرایا تو ہم تینوں یعنی قائدِاعظم، فاطمہ جناح اور میں آنسوؤں سے رونے لگے۔ نواب صاحب نے کہا کہ چلتے وقت جناح صاحب مجھے یہ کہہ گئے کہ اسمبلی کے اجلاس کے بعد میری وائسرائے سے ملاقات ہو گی تو میں ان سے کہوں گا کہ مسلم لیگ کی جڑیں اب زمین کی تہ میں پہنچ گئی ہیں۔

حضرت والا نے اس ناچیز غلام کی تمام طمع کی جڑیں کھرچ کر صاف کر

دی ہیں اور غلام کو ایسا غنی کر دیا ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کو دل نہیں چاہتا بلکہ خیال تک بھی نہیں ہوتا۔ نواب صاحب نے میری بہت تعریف کی۔ یہ سب حضرت والا کی برکت ہے۔ غلام حضرت والا سے دعا چاہتا ہے۔

زیادہ حد ادب والسلام!

خادم بندو باغپتی۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۴۳ء

اس خط کے حاشیہ پر حضرت تھانوی کے قلم حقیقت رقم سے یہ جواب تحریر ہے:۔

"السلام علیکم! شاباش ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ اللہ تعالیٰ اس دولت میں اور ترقی دے۔ میں اس قدر مسرور ہوا کہ کوئی مضمون بھی ذہن میں نہیں آتا۔"

قائدِ اعظم کا خراجِ تحسین

متذکرہ بالا خطوط سے نہ صرف حضرت تھانوی کی تبلیغی مساعی پر مزید روشنی پڑتی ہے، بلکہ ان سے صاف ظاہر ہے کہ قائدِ اعظم کے دل میں حضرت تھانوی کی کتنی عزت و عظمت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قائدِ اعظم کی نظر میں حضرت تھانوی کے بعد کوئی عالم جچتا ہی نہ تھا، جیسا کہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرتؒ کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے کہ بمبئی میں جمیعتہ علماء اسلام کی کانفرنس ہوئی۔ جس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ہیں اور مولانا محمد طاہر مرحوم وغیرہ شریک ہوئے تو بمبئی کے چند تاجر جن کو حضرتؒ سے تعلق تھا۔ ہم سے ملے اور بیان کیا کہ قائدِ اعظم کی مجلس میں ایک دفعہ یہ گفتگو آئی کہ کانگرس میں علماء زیادہ ہیں اور مسلم لیگ میں علماء کوئی نہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سن کر قائدِ اعظم نے جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ تم کن کو علماء سمجھتے ہو؟ انھوں نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا نام لیا۔ قائدِ اعظم نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد عالم ہیں، مگر ان کی سیاست ایک ہی ہے کہ انگریزوں کے

کے دشمن ہیں ۔ اس دشمنی میں وہ مسلمانوں کے مفاد کی بھی رعایت نہیں کرتے مولانا کفایت اللہ صاحب واقعی مفتی ہیں اور کچھ سیاست دان بھی لیکن ابوالکلام نہ عالم ہے، نہ سیاستدان ہے۔ مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے۔ جس کا علم وتقدس وتقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں جو چھوٹے سے قصبہ میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں۔"

تاثراتِ سفیرِ اشرف | قائدِ اعظم سے بار بار ملاقات کرنے والے سفیرِ اشرف مولانا شبیر علی صاحب تھانوی ان کے متعلق اپنے مشاہدات و واردات کی بناء پر لکھتے ہیں کہ :-

"بعض حضرات کو میں نے کہتے سُنا ہے کہ جناح صاحب بہت ضدی تھے ۔ مگر میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر بالکل وثوق سے کہتا ہوں کہ ضد اور ہٹ دھرمی آپ کے پڑوس میں بھی نہ رہتی تھی ۔ وہ مشورے کرتے رہتے تھے۔ بحث بھی خوب کرتے تھے اور جب کوئی بات سمجھ میں آجاتی تھی، تو ہر مرتبہ وہ ان الفاظ میں اعتراف کرتے کہ" میری غلطی تھی، اب میری سمجھ میں آگیا، آپ صحیح کہتے ہیں"، تو بھلا جو شخص مجھ جیسے شخص کے سامنے غلطی کا اعتراف کرکے بات کو تسلیم کرے، اُس کو میں ضدی کیسے سمجھوں۔ ہاں بعد بحث وتمحیص کے جو بات طے کر لیتے تھے، پھر اس پر پختہ رہتے تھے ڈھل مل یقین نہ تھے۔ یہ نہ تھا کہ میں گیا تو میرے ہمنوا ہوگئے اور دوسرا گیا تو اُس کے ہمنوا بن گئے"

(روئیداد صہ)

تبلیغ نامہ | قائدِ اعظم سے چونکہ اردو میں خط وکتابت مفید نہ ہو سکتی تھی۔ اس

سے ان کی خاطر اللہ والوں نے اپنے پاس انگریزی مترجم رکھے ہوئے تھے۔ جو ان کی عرضداشتوں کو انگریزی میں ترجمہ اور ٹائپ کراکے ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے ایک موقعہ پر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کو مترجم دستیاب نہ ہو سکا اور انہوں نے اپنا خط بنام قائدِ اعظم مجھے ڈھاکہ سے روانہ کیا کہ میں اس کا بہترین بامحاورہ انگریزی ترجمہ کرا کر حضرت قائدِ اعظم کو بھیج دوں اور اصل خط اپنے رسالہ "پیغامِ اسلام" میں شائع کردوں جو درج ذیل ہے:۔

"مکرم المحترم عالی جناب مسٹر محمد علی صاحب جناح صدر پاکستان دام اقبالہٗ

السلام علیکم۔ سب سے پہلے تو میں جناب والا کو اس پر مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے پاکستان کیلئے آپ کی مساعی جمیلہ کو کامیاب فرمایا پھر اس پر مبارک باد دیتا ہوں کہ سلہٹ اور سرحد پاکستان میں شامل فرمایا اور امید ہے کہ انشاء اللہ جلپائی گوڑی دارجلنگ پکھباڑ۔ گوالپاڑہ۔ لہکنا۔ چوبیس پرگنہ۔ کلکتہ۔ پورنیہ اور جزائر انڈمان بھی پاکستان میں شامل ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کی آبادی میں جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے۔ مسلم اکثریت ہے اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو مسلم لیگ کو اس میں جدوجہد کرنا چاہیئے۔ تیسری مبارک باد اس نعمت غیر مترقبہ پر پیش کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے پاکستان کا پہلا گورنر جنرل جناب والا کو بنایا۔ مسلمانوں کو عموماً اس سے جس قدر خوشی اور فرحت ہوتی ہے۔ اس کو الفاظ سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سب لوگ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز فرما دیں اور آپ کے سایۂ عاطفت میں پاکستان کو بہت جلد عظیم الشان مستحکم و قابلِ فخر اسلامی سلطنت بنائیں آمین۔ اس کے بعد عرض یہ ہے کہ اس دوسری جنگِ عظیم نے کائناتِ انسانی کو جن مصائب سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں اور ابھی ایک تیسری جنگِ عظیم کے لئے مادہ پک رہا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ آئندہ جنگ کے کیا نتائج ہوں گے؟ اور دنیا کی بڑی

سلطنتوں کا آئندہ نقشہ کیا ہوگا ؟ ہاں کتاب وسنت کی روشنی میں بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ عالمگیر اضطراب و بے چینی اُس مدنیت فاسدہ اور ظالمانہ طرز حکومت کا معاکستہ عمل ہے ۔ جس میں آج یورپ اور اس کی تقلید سے دنیا کی تمام سلطنتیں مبتلا ہیں ۔

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون ۔ (روم)

بحر و بر کا ہمہ گیر فساد انسانوں کی بدعنوانیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہے تاکہ خدا ان کی بدکرداریوں کا کچھ مزہ چکھائے شاید وہ اس طرح حق کی طرف رجوع کریں ۔

قرآن کریم کے ایک ایک لفظ سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ خدائے قدوس کی مخفی اور پراسرار قوتیں ہر وقت اپنے کام میں مصروف اور مناسب وقت کی منتظر رہتی ہیں ۔

ولا تحسبن اللہ غافلا عما یعمل الظالمون (ابراہیم)

تم اللہ کو ان ظالموں کی بدکرداریوں سے غافل تصور نہ کرو ۔

قرآن کریم انسانوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ سنن الہیہ اور مکافات عمل کے قدرتی نتائج پر غور کرو ۔ اقوام سابقہ کی تاریخ کو گہری نظر سے دیکھو کہ ہم نے ان ظالم اقوام کے ساتھ کیسا سلوک کیا ؟ قدرت کا قانون یہ ہے کہ جب انسانی آبادی ظلم و عدوان ۔ جبر و قہر ۔ زبردستی ۔ خودغرضی شہوت پرستی ۔ اخلاقی گندگی اور غصب حقوق انسانی سے مضطرب ہو جاتی ہے ۔ تو خدا کی انتقامی قوتیں حرکت میں آجاتی ہیں ۔ پھر کیا ہوتا ہے ؟ آبادیوں پر قہر الہی نازل ہوتا ہے ۔ یہ عذاب الہی کبھی آسمان کی بلندی سے اُترتا ہے کبھی زمین کے نیچے سے اُبلتا ہے اور کبھی اقوام عالم میں حسد و رقابت کی چنگاریاں سلگنے لگتی ہیں اور ان کو خطرناک طبقاتی جنگ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے ۔ جس

کی شعلہ باریوں سے انسانوں کے ردی عناصرِ فاسدہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور صالح عناصر باقی رہ جاتے ہیں جو صحیح طور پر خدا کی زمین میں نیکی وامن وامان و عدل وانصاف پھیلاتے اور بداخلاقی بددیانتی اور ظلم و عدوان کی جڑیں اکھاڑ کر پھینکتے ہیں اور

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون ۔	یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے ۔

کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بحر و بر پر چھا جاتے ہیں ۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان قوتوں کی تباہی کا سبب نوامیس الٰہیہ کی توہین ۔ ان کے طرزِ اجتماع کا فساد تھا ۔ ان کے فکر و عمل اور طریقِ تمدن میں رخنہ پڑ گیا تھا ۔ ضابطۂ اخلاق کی کڑیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں ۔

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا فتلک مساکنھم لم تسکن من بعدھم الا قلیلا ؕ (قصص)	اور ہم نے کتنی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جنہوں نے اپنی عیش پر اترانا شروع کر دیا تھا ۔ اب یہ اُن کے امکانات ہیں جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہوئے ۔
واذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا (بنی اسرائیل)	جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس میں بہت سے مالدار خوشحال پیدا کر دیتے ہیں ۔ پھر وہ اس میں فسق و فجور کرتے ہیں ۔

قرآن کریم نے ہر قوم کی دو حالتیں دکھائی ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ قوانین طبعی اور نوامیس الٰہیہ کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے ۔ اخلاق وسیرت ۔ تمدن اور معاشی اعتبار سے بہت اونچی سطح پر کھڑی ہے ۔ امن وخوش حالی اور سیر و فراغ کے تمام وسائل اسے میسر ہیں ۔ آزادی اور حریت کی نعمت سے مالا مال ہے اور ان نعمتوں کو بداخلاقی اور ظلم کا ذریعہ نہیں بناتی ۔ دوسری حالت

کی شعلہ باریوں سے انسانوں کے ردی عناصرِ فاسدہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور صالح عناصر باقی رہ جاتے ہیں جو صحیح طور پر خدا کی زمین میں نیکی و امن و امان و عدل و انصاف پھیلاتے اور بداخلاقی بددیانتی اور ظلم و عدوان کی جڑیں اکھاڑ کر پھینکتے ہیں اور

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون ۔	یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے ۔

کا نعرہ بلند کرتے ہوتے بحر و بر پر چھا جاتے ہیں ۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان قوتوں کی تباہی کا سبب نوامیس الٰہیہ کی توہین ۔ ان کے طرز اجتماع کا فساد تھا ۔ ان کے فکر و عمل اور طریقِ تمدن میں رخنہ پڑ گیا تھا ۔ ضابطہِ اخلاق کی کڑیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں ۔

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا فتلک مساکنھم لم تسکن من بعدھم الا قلیلا ۔ (قصص)	اور ہم نے کتنی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جنہوں نے اپنی عیش پر اترانا شروع کر دیا تھا ۔ اب یہ اُن کے امکانات ہیں جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہوئے ۔
واذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا (بنی اسرائیل)	جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس میں بہت سے مالدار خوشحال پیدا کر دیتے ہیں ۔ پھر وہ اس میں فسق و فجور کرتے ہیں ۔

قرآن کریم نے ہر قوم کی دو حالتیں دکھائی ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ قوانین طبعی اور نوامیس الٰہیہ کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے ۔ اخلاق و سیرت ۔ تمدن اور معاشی اعتبار سے بہت اونچی سطح پر کھڑی ہے ۔ امن و خوش حالی اور سیر و فراغ کے تمام وسائل اسے میسر ہیں ۔ آزادی اور حریت کی نعمت سے مالا مال ہے اور ان نعمتوں کو بداخلاقی اور ظلم کا ذریعہ نہیں بناتی ۔ دوسری حالت

یہ ہے کہ دولت و ثروت کی فراوانی اور سامان معیشت کی کثرت نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ وہ نشۂ دولت میں مخمور اور نوامیس مذہب سے نفور ہو چکی ہے۔ اخلاقی قیود اور قوانین سے آزاد اور خلاف فطرت شہوت کی غلام بن چکی ہے۔ یہی وہ ناقابل اصلاح حالت ہے۔ جس سے قدرت کا ضابطۂ انتقام حرکت میں آجاتا ہے اقوام حاضرہ کا طرز اجتماع اور طریق سیاست بھی اسی مرحلہ پر پہنچ چکا ہے اور یہ صرف میں ہی نہیں کہتا۔ بلکہ خود یورپ کے اہل دماغ اور سنجیدہ طبقے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ آج یورپ کی سیاست اور تمدنی حالت خطرناک درجہ پر پہنچ چکی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ اہل یورپ کی مادہ پرستی۔ زر پرستی اور مذہب سے قطع تعلق ہے۔ جس نے اُن اقوام کو اخلاقی قیود اور نوامیس فطرت کی پابندی سے بے نیاز کر دیا ہے۔ عالمگیر اخوتِ انسانی صرف چند گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی چیز نے ان کو دائمی اضطراب اور بے چینی اور شورش و بدامنی کے بے پناہ سمندر میں دھکیل دیا ہے۔ اس ہلاکت خیز تمدن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے ہر چند ان کے اہلِ فکر کوشش کر رہے ہیں مگر اب جبکہ اس تمدن فاسد کی لہروں نے تمام یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے کوئی کوشش کامیابی کی منزل پر نہیں پہنچتی۔ چنانچہ مشہور مصنف فرانسیسی فیرنس جیافرت نے اپنی کتاب النعمۃ الحاضرہ میں اس کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے۔

قائدِ اعظم! آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ میری طویل تحریر سے گھبرا نہ جائیں۔ مگر یقین جانیے کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ وقت سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ آج خدا نے آپ کو ایک نئی سلطنتِ اسلامیہ کا صدر یا گورنر جنرل بنایا ہے۔ اسی وقت اس کے لئے طرزِ حکومت اور طریق تمدن تیار کرنے کی پوری کوشش فرما دیں۔ حکومتِ پاکستان کی بنیاد

نوامیس الٰہیہ قوانین مذہب اور اصول اخلاق کی پابندی پر قائم ہونی چاہیئے۔
اس کا تمدن اسلامی عدل وانصاف اور تقویٰ پر مستحکم ہونا چاہیئے۔
آپ کو اس کی پوری فکر کرنا چاہیئے کہ لوگوں میں مذہب اور خدا سے آزادی پیدا نہ ہونے پائے۔ جس قوم میں یہ آزادی راہ پالیتی ہے وہ کبھی سیدھی راہ پر نہیں آسکتی۔ نہ اس میں دیانتدار بے غرض آدمی پائے جاتے ہیں۔ خوفِ خدا اور خوف عذاب آخرت ہی انسان میں بے غرضی، دیانت امانت۔ حیا۔ شرافت کے جواہر کو ترقی دیتا ہے۔ حضرت سیدنا فاروق اعظمؓ کی سیاست کو سامنے رکھا جائے۔ تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان کی تمام تر کامیابی کا راز اس میں مضمر تھا کہ ان کی حکومت وسیاست کی بنیاد تقویٰ اور عدل وانصاف پر تھی۔ تقویٰ کی وجہ سے اسلامی آبادی کا بڑا حصہ اعلیٰ اخلاق فاضلہ سے آراستہ تھا۔ ہر شخص دیانتدار امانت دار۔ بات کا سچا نگاہ ودل کا پاکیزہ تھا۔ اس لئے ملک میں جرائم کا وجود بہت کم تھا۔ اور کبھی کسی نے جرم کیا تو فاروق اعظمؓ نے اپنے بیٹے تک کی رعایت نہیں کی۔ فی الفور اس پر حدِ اسلامی جاری فرمائی۔ یہ عدل وانصاف تھا۔ جس کی وجہ سے قلوبِ رعایا میں ان کی محبت تھی اور عظمت تھی۔

قائدِ اعظم! آپ یورپ سے مشینری حاصل کیجئے۔ اس سے اسلحہ سازی کا سامان لیجئے۔ انجنیری اور کیمیاوی تجربے اور سائنس کے مفید شعبے ضرور لیجئے تاکہ پاکستان کی معدنیات اور خداداد مخفی خزائن سے نفع اٹھا سکیں۔ لیکن اس کا تمدن۔ اخلاق سوز۔ حیا سوز۔ طرز معیشت ہرگز نہ لیجئے۔ بلکہ اس کو پاکستان کی ابتداء ہی میں اپنے ملک سے نکال دیجئے۔ میری مراد سنیما تھیٹر بے پردگی۔ گانا بجانا۔ جوا۔ سٹہ بازی۔ سود اور رشوت سے ہے۔ اسی طرح زناکاری کے اڈے قائم کرنا۔ رنڈیوں کو لائسنس دینا۔ یہ تمام تر یورپ کی نحوست ہے۔ اسلام ان ناپاک حرکتوں کو کسی طرح برداشت نہیں کرسکتا

پس پاکستان کو ان ناپاکیوں سے اوّل ہی دن پاک کر دینا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ شانہ کے اس ارشاد کو ہر دم پیشِ نظر رکھیئے ۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور ہ	مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں سلطنت اور طاقت دے دیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کاموں کا امر کریں اور بُرے کاموں سے روکیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے ۔

اس میں اللہ تعالےٰ نے صاف بتلا دیا ہے کہ مسلمانوں کو تو سلطنت دینے سے ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ بادشاہی پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں ترقی کریں ۔ فرعونیت اور غرور کو اپنے اندر راہ نہ دیں ۔ بلکہ خدا کے سامنے خود بھی جھک جائیں اور دنیا کو جھکا دیں ۔ یہ تو خالق کے ساتھ معاملہ ہے اور مخلوق سے معاملہ یہ ہو کہ غریبوں مفلسوں کی پرورش کے لئے زکوٰۃ دیتے رہیں جو مالداروں سے لی جاتی ہے اور فقراء پر تقسیم کی جاتی ہے ۔ زکوٰۃ وعشر کا جو نظام اسلام نے مقرر کیا ہے ۔ وہ مفلسوں کا افلاس اور فقیروں کا فقر دور کرنے کے لئے پوری طرح ضامن ہے ۔ جب تک بیت المال کا نظام مکمل تھا مسلمانوں میں افلاس و فقر کا نام و نشان باقی نہ تھا ۔ حکومتِ پاکستان کو یہ نظام مکمل کرنا چاہیئے اور خالق ومخلوق دونوں کے ساتھ تعلق کی صورت یہ ہونا چاہیئے کہ نیک کاموں کی خود بھی پابندی کرتے رہیں اور دوسروں کو بھی حکم دیتے رہیں ۔ بُرے کاموں سے خود بھی دور رہیں اور رعایا کو بھی روکتے رہیں ۔ اس کے لئے حکومتِ پاکستان کو تبلیغی ادارہ بھی قائم کرنا چاہیئے اور محکمہ احتساب بھی ۔ اگر اس مقصد کو حکومتِ پاکستان نے اچھی طرح ادا کیا تو خدا کی مدد اس کے ساتھ ہوگی اور اگر اس مقصد کو ادا نہ کر سکی تو جس مقصد کے لئے اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو سلطنت دیتے ہیں ۔

اس میں وہ ناکام رہے گی اور جو سلطنت اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی عمر زیادہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بہت مختصر اشارہ ہے۔ امید ہے کہ جناب والا اس کی تفصیلات کو خود ہی سمجھ جائیں گے۔ والسلام۔

بندہ ظفر احمد عثمانی تھانوی

خواہرزادہ

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب

تھانوی قدس سرہٗ

چنانچہ یہ خط راقم الحروف نے ترجمہ اور ٹائپ کرا کر قائدِ اعظم کو بصیغہ رجسٹری بھیج دیا۔ جس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علماء ربانی پاکستان کے قیام و استحکام کے سلسلہ میں کتنی مخلصانہ کوششیں کر رہے تھے۔

نتائجِ تبلیغ

قرآن اور مومن پیشتر اس کے کہ نتائجِ تبلیغ کی تفصیل پیش کی جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی رو سے مومن کے مقام کی نشاندہی کردی جائے تاکہ واقعات کے آئینہ میں اور قرآن کی روشنی میں آپ کو قائدِ اعظم کے صحیح مقام کا اندازہ ہوسکے۔ قرآن پاک میں مومن کی مختلف مقامات پر یہ تعریف آئی ہے کہ:۔

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ۲/۱۴)

وہ ایمان والے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاتے۔ پھر شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں لڑے وہی سچے لوگ ہیں۔

(۲) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ط الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط (انفال ۹/۱)

وہی ایمان والے ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے۔ اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ وہی سچے مومن ہیں۔

اور انہی صادق اور سچے مومنوں کو حق تعالےٰ نے قرآنِ پاک میں ولی اور متقی قرار دیا ہے۔

وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ (جاثیہ ۲۵) — اللہ پرہیزگاروں کا دوست ہے۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (زمر ۲۴) — اور جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اسکو سچ جانا وہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

اور انہی کو اعزاز و اکرام کی بشارت دی:۔

(۱) اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (الحجرات ۲۶) — تحقیق اللہ کے ہاں اس کی بڑی عزت ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ۱۶) — بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے اللہ تعالےٰ ان کیلئے (لوگوں کے دلوں میں) محبت پیدا کر دے گا۔

(۳) وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (النور ۱۸)۔ — تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو ضرور ملک میں حکومت دے گا۔ جیسے اس نے ان سے اگلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔

(۴) اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس ۱۱) — یاد رکھو! جو لوگ اللہ کے دوست ہیں، اُن کو نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(۵) اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا (النبا ۲) — بے شک پرہیزگار لوگ مراد کو پہنچیں گے

(۶) اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ (ص ۴) — بالتحقیق پرہیزگاروں کے لئے اچھا ٹھکانا ہے۔

حق تعالےٰ نے ایک مومن کی جو شناخت بیان فرمائی ہے اور جن کے لئے انعامات و اعزازات کا وعدہ فرمایا ہے۔ قائدِ اعظم میں بھی یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جو حقائق ذیل سے عیاں ہیں:۔

اہمیتِ نماز | ارکانِ اسلام میں ایمان بالغیب کے بعد سب سے بڑا رکن نماز ہے

جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ مبارک کے مطابق "کفر و ایمان میں امتیاز پیدا کرتی ہے"۔ جس کی اہمیت کا اندازہ ان امور سے لگایا جا سکتا ہے کہ:۔

۱۔ اس کا قرآن میں ساڑھے سات سو مرتبہ ذکر آیا ہے۔

۲۔ جو بلا کسی عذرِ شرعی کے صحت و علالت، جلوت و خلوت، رزم و بزم اور سفر و حضر، غرض کہ کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔

۳۔ امام اعظمؒ کے نزدیک اس کے تارک کے لئے بدنی سزا اور حبس دوام ہے۔ تا وقتیکہ توبہ نہ کرے اور

۴۔ دیگر تین آئمہ کے نزدیک اس کا تارک واجب القتل ہے۔

اسی لئے فاروقِ اعظم نے عنانِ خلافت سنبھالتے ہی اپنے تمام گورنروں کو لکھا تھا کہ:۔

ان اھم امرکم عندی الصلوٰۃ فمن ضیعھا فھو لما سواھا اضیع (موطا)	میرے نزدیک تمہارے سب کاموں سے زیادہ اہم کام نماز کی اقامت و پابندی ہے۔ جس نے اسے ضائع کیا اس نے دوسرے کاموں کو اور بھی زیادہ ضائع کیا۔

اور سفاکِ اعظم حجاج بن یوسف نے فتح کراچی کے مژدہ کے جواب میں محمد بن قاسم کو لکھا تھا کہ:۔

"پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ ہو۔ تکبیر و قرأت، قیام و قعود، رکوع و سجود میں خدا تعالیٰ کے روبرو تضرع و زاری کیا کرو۔ زبان پر ہر وقت ذکرِ الٰہی جاری رکھو۔ کسی شخص کو شوکت و قوت خدا تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی۔ اگر تم خدا تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھو گے تو یقیناً مظفر و منصور ہو گے۔" (آئینہ حقیقت نما صہ ۱۰۵ جلد اول)

چنانچہ مجدد الملّت حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اپنے تبلیغی وفد کے ذریعہ قائدِ اعظم کی توجہ سب سے پہلے نماز کی طرف مبذول کرائی اور انہوں نے بکمال ندامت نماز نہ پڑھنے

کے گناہ کا ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے اقرار کرتے ہوتے نماز پڑھنے کا وعدہ فرمایا اور بعدازاں تادمِ آخر پابندی کے ساتھ اپنے آبائی طریق کی بجائے مسنون طریقہ سے نماز پڑھتے رہے۔ اور جب کبھی باجماعت نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، تو سوادِ اعظم کی مسجد میں ہی نماز پڑھی جس کا اہلِ تشیع کے ممتاز رہنما راجہ صاحب محمود آباد کو شکوہ کرنا پڑا۔ مولانا شبیر علی صاحب اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ :-

"جناب مقبول حسین صاحب وصل بلگرامی غالباً اپریل یا مئی ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے تھانہ بھون آئے۔ کیونکہ اخیر عمر میں وہ مستقل طور پر خانقاہ اشرفیہ میں ہی رہتے تھے۔ انہوں نے حضرت (تھانوی ؒ) سے عرض کیا کہ جناح صاحب پر جناب کی تبلیغ کا بہت اثر ہوا ہے۔ میں راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں بیٹھا تھا جو حال ہی میں دہلی سے آئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو ایک عجیب واقعہ سناؤں۔ وہ یہ کہ جناح صاحب باقاعدہ پنجگانہ نماز ادا کرتے ہیں اور نماز سنیوں کے طریق پر پڑھتے ہیں۔ گویا کہ یہ واقعہ حضرت کے فرستادوں کی فروری ۱۹۳۹ء کی ملاقات کے بعد کا ہے" (صنا)

چنانچہ اخیر وقت ان کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ بھی مسنون طریق پر ہوئی۔

خوف و خشیّت عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب انسان کسی بہت اونچے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ عجب و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کو بھول جاتا ہے اور اپنی سرفرازی و سربلندی کو اپنی تدابیر اور زور بازو کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے مگر ایک صاحبِ ایمان ایک ثانیہ کے لئے بھی اپنے خالق و مالک کو نہیں بھول سکتا۔ خواہ وہ دینوی لحاظ سے کسی بڑے سے بڑے مقام پر کیوں نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ تبلیغی وفد نے جب قائدِ اعظم سے سوال کیا کہ :-

"آپ پر بھی تو نماز فرض ہے، آپ کیوں نہیں پڑھتے؟"

تو اس وقت وہ کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ فرض کے لفظ سے دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرنے والے قائدِ اعظم پر اپنے مالک و خالق کا اتنا رعب اور خوف طاری ہوا کہ وہ آگے کو جھک گئے اور اپنی کوتاہی کی ہماری طرح کوئی تاویل کرنے کی بجائے ایک خاصے مجمع کے سامنے نہایت ندامت کے لہجہ میں فرمایا کہ:۔

"میں گنہگار ہوں۔ خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا"

اور جب نماز شروع کی تو اُن پر بحالت نماز خشوع و خضوع کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ اور وہ اکثر خلوت میں احکم الحاکمین کے دربار میں سربسجدہ آہ و زاری کرتے دیکھے گئے۔ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میرے ایک معتبر دوست نے مجھ سے بیان کیا کہ ان سے مولانا حسرت موہانی صاحب نے بیان کیا کہ میں ایک روز جناح صاحب کی کوٹھی پر صبح ہی صبح ایک نہایت ضروری کام سے پہنچا اور ملازم سے میں نے اطلاع کرنے کو کہا۔ ملازم نے کہا کہ اس وقت ہم کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ تشریف رکھیئے۔ تھوڑی دیر میں جناح صاحب خود تشریف لے آویں گے۔ چونکہ مجھے نہایت ضروری کام تھا اور میں اس کو جلد سے جلد جناح صاحب سے کہنا چاہتا تھا۔ اس لئے مجھے ملازم پر غصہ آیا اور میں خود کمرہ میں چلا گیا ایک کمرے سے دوسرے کمرہ میں پھر تیسرے کمرہ میں پہنچا تو برابر کے کمرہ سے مجھے کسی کے بہت ہی بلک بلک کر رونے اور کچھ کہنے کی آواز آئی۔ آواز چونکہ جناح صاحب کی تھی اس لئے میں گھبرا گیا اور آہستہ سے پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جناح صاحب سجدہ میں پڑے ہیں اور بہت ہی بے قراری کے ساتھ کچھ دعا مانگ رہے ہیں۔ میں دبے پاؤں وہیں سے واپس آگیا اور اب تو بھائی جب جاتا ہوں اور ملازم کہتا ہے کہ اندر ہیں تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ سجدہ میں پڑے ہوئے دعا کر رہے ہیں۔ میرے

تصور میں ہر وقت وہی تصویر اور وہی آواز رہتی ہے۔"

نظریہ کی تبدیلی | جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے، قائدِ اعظم سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کے متمنی تھے۔ مگر جس روز حضرت تھانوی کے فرستادہ وفد نے قائدِ اعظم پر واضح کر دیا کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کر دینے سے برکت و کامیابی ممکن نہیں، تو انہوں نے مذہب کو سیاست پر فوقیت دینی شروع کر دی۔ ان کی تقاریر کا موضوع بدل گیا۔ ان میں اسلامیت کا رنگ غالب نظر آنے لگا اور انہوں نے برملا کہنا شروع کر دیا۔

"اسلام صرف چند عقائد و عبادات کا نام نہیں بلکہ اسلام سیاسیات، معاملات، معاشرت اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ ہمیں ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔"

وضع اسلامی کی پابندی | قائدِ اعظم کی تعلیم و تربیت چونکہ انگریزی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لئے وہ انگریزی لباس پہننے کے عادی تھے۔ تبلیغی وفد نے انہیں وضع اسلامی اختیار کرنے کی ترغیب دی اور جب ان پر تشبہ فی الاسلام کی اہمیت اور تشبہ فی الکفار کی مضرت واضح ہوگئی تو انہوں نے ہر وقت انگریزی لباس میں ملبوس رہنے کی عادت ترک کر دی۔ اور اکثر و بیشتر اسلامی لباس میں منظرِ عام پر نظر آنے لگے۔ جس کے بعد جناح کیپ، شیروانی اور شلوار قومی لباس کی حیثیت اختیار کر گئی۔

تعلیماتِ قرآن | حضرت تھانویؒ نے خطوط اور وفود کے ذریعہ جو تبلیغی سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ اس سے قائدِ اعظم کے دل میں تعلیماتِ قرآن پر عبور حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ انہوں نے قرآن کریم اور دیگر اسلامی لٹریچر کا بغور مطالعہ شروع کر دیا۔ جس سے ان کے خیالات میں بتدریج انقلاب آ تا گیا۔ جب ان سے اگست ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد

دکن میں طلباء نے سوال کیا کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟ تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے خود اس امر کا انکشاف کیا اور فرمایا کہ :-

"جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں، تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی سیاسی ہو یا معاشی غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔" (حیاتِ قائدِ اعظم صفحہ ۴۲۷)

خدا اعتمادی یوم استقلالِ پاکستان کے تاریخی موقع پر ہندوستان کے آخری انگریز گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن کی اس واضح اطلاع و انتباہ کے باوجود کہ :-

"اس موقعہ پر سکھوں نے تمہیں بم سے اڑا دینے کا منصوبہ مکمل کر رکھا ہے۔ ایسے حالات میں نہ آپ کے لئے جلوس نکالنا مناسب ہے اور نہ میرے لئے اس میں شرکت"۔ (ملاحظہ ہو کتاب مشن وِد مونٹ بیٹن)

قائدِ اعظم نے اپنی قوتِ ارادی اور خدا اعتمادی سے لارڈ مونٹ بیٹن کو اس موقعہ پر کراچی بلایا اور کھلی کار میں کراچی کے بازاروں میں شاہانہ شان و شوکت سے گزر کر دکھایا۔ مگر کسی بدباطن کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی اور مونٹ بیٹن کو رخصت

کرتے وقت قائدِ اعظم نے جتلا بھی دیا کہ تم یہاں سے بخیریت واپس جارہے ہو۔ اگرچہ ان کے سیکرٹری اور کتاب مذکور الصدر کے مصنف کے قول کے مطابق ان کے دل میں اس بات کا بہت بڑا رنج تھا کہ قائدِ اعظم ان کے استقبال کے لئے ہوائی اڈہ پر کیوں نہ آئے۔ مگر اس مردِ خدا کے پہلو میں بیٹھ کر انہوں نے محسوس کیا کہ واقعی یہ اس دور کا ایک باعظمت انسان ہے۔ جس کے پاس ہمیں ہی چل کر جانا مناسب تھا۔

توکّل علی اللہ | "حق تعالیٰ نے قائدِ اعظم کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ امارت، وجاہت، ہمت، سیاست، عزت، عظمت، محبوبیت، مقبولیت، اختیار، اقتدار حاصل ہونے کے باوجود وہ اسباب پر نہیں، بلکہ ہمیشہ مسبب الاسباب پر نظر رکھتے تھے۔" (بحوالہ صدر)

یہ اسی تفویض و توکّل کا اثر ہے کہ رہنماؤں کی خود غرضیوں اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود پاکستان مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ اور انشاء اللہ مضبوط ترین ہوتا چلا جائے گا۔

عاجزی و انکساری | آج ہر کس و ناکس حصولِ پاکستان کو قائدِ اعظم کا تاریخی کارنامہ اور ملّت پر ان کا احسانِ عظیم بتلاتا ہے۔ مگر قائدِ اعظم اسے اپنا کارنامہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ آخری وقت فرماتے تھے کہ:-

"یہ مشیتِ ایزدی ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی فیض ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے قرطاسِ سفید سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی، آج وہ قوم آزاد ہے۔ اُس کا اپنا ملک ہے، اپنا جھنڈا ہے، اپنی حکومت ہے، اپنا سکّہ ہے۔ اپنا آئین ہے اور اپنا دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی انعام ہو سکتا ہے۔ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے رسول اکرم سے

کیا تھا کہ اگر تیری اُمت نے صراطِ مستقیم کو اپنے لئے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اس انعامِ عظیم کی حفاظت ہر پاکستانی مرد و زن، بچے بوڑھے اور جوان پر فرض ہے۔

جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے، تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے بارگاہِ ربّ العزت میں سجدۂ شکر بجا لانے کے لئے فرطِ انبساط سے جھک جاتا ہے۔" (آخری لمحات)

اتنے بڑے انعام اور اتنی عظیم کامیابی پر فخر و غرور کی بجائے عجز و نیاز کا اظہار کرنے اور سجدۂ شکر بجا لانے کی ایک غیر مومن سے کب توقع ہو سکتی ہے۔

دنیا سے نفرت مردِ مومن جب اپنے صحیح مقام پر پہنچ جاتا ہے تو مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق وہ اس دنیا کو اپنے لئے ایک قید خانہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے جلد رُستگاری حاصل کرنے اور اپنے آقا و مولا کے حضور میں پہنچنے کے لئے بیقرار رہتا ہے۔ وہ موت سے خوف نہیں کھاتا بلکہ اسے رحمت تصور کر کے اس کا منتظر رہتا ہے۔ اسے دوسروں کی طرح دنیا و مافیہا کی محبت نہیں ستاتی۔ دنیا کو چھوڑنے کا اُسے کوئی رنج و غم نہیں ہوتا بلکہ وہ پورے اطمینان قلب کے ساتھ اس فانی دنیا سے رخصت ہوتا ہے چنانچہ یہی حالت قائدِ اعظم کی تھی۔

کوئٹہ میں علاج معالجہ سے جب کچھ افاقہ ہوا تو ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش صاحب نے باتوں باتوں میں قائدِ اعظم سے کہا:۔

"ہماری انتہائی کوشش ہے کہ آپ کی صحت اتنی اچھی ہو جائے کہ جتنی آپ کی صحت سات آٹھ برس پہلے تھی۔"

قائدِ اعظم یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا:۔

"چند سال قبل یقیناً میری یہ آرزو تھی کہ میں زندہ رہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں موت سے ڈرتا تھا، بلکہ اس لئے زندہ رہنا چاہتا تھا کہ قوم نے جو کام میرے

تبدیلیٔ مذہب و عقیدہ

کامیابی کا راستہ قرآن کریم نے حق تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کا یہ طریقہ بتلایا ہے کہ:۔

"اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے۔ تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں
ثابت قدم رکھے گا"

اللہ کے دین کی مدد یہ ہے کہ —— حکومتِ الٰہیہ قائم کی جائے۔ حدودِ شرعی نافذ کی جائیں اور قرآن و سنت کے مطابق تمام کاروبارِ زندگی چلایا جائے —— جب کوئی مردِ مومن اس نیت سے میدانِ عمل میں نکلتا ہے تو اسے تائیدِ ایزدی حاصل ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت و محبت پیدا کر دی جاتی ہے۔ اس کا دل ایمان و ایقان کے جذبے سے لبریز کر دیا جاتا ہے۔ وہ دشمن کی عددی کثرت اور فراوانی اسلحہ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بلکہ دلیر، بیباک اور نڈر ہو کر ہر محاذ پر دشمن کا مقابلہ کرتا ہے اور فتح و نصرت کے ساتھ تاریخ کے اوراق پلٹ دیتا ہے۔ ایسا مومن و مجاہد ہر روز پیدا نہیں ہوا کرتا۔ اس کی آمد کے لئے صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے۔ بقول شاعر دربارِ اشرفیہ جناب عزیز الحسن مجذوب ؎

کہیں مُدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

ایسے مردِ مجاہد عام طور پر اس وقت پیدا کئے جاتے ہیں جب اہل اپنا فرض بھول جاتے ہیں۔ اہل حضرات کی فرض ناشناسی اور غفلت شعاری جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ تو اس وقت سُنت اللہ کے مطابق نااہلوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کر کے ان کو امت مسلمہ

کی قیادت و رہنمائی کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ جیسے مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا احمد علی لاہوری کو غیر مسلموں کی صف سے نکال کر خدمتِ دین و قرآن پر مامور کر دیا گیا۔ بالکل اسی طرح ہندوستان کے نامور دینی رہنماؤں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کو نظر انداز کر کے، کارساز حقیقی نے ہندوستان میں پاکستان کے قیام کے لئے مسٹر محمد علی جناح کو منتخب فرمالیا۔ جنہوں نے کبھی کسی دینی درسگاہ سے مذہبی تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ جن کی ساری تعلیم و تربیت انگریزی ماحول میں ہوئی تھی اور جو مغربی تہذیب و تمدن کے نہ صرف دلدادہ تھے بلکہ اس کا بہترین نمونہ تھے۔

دینی تعلیم | کارسازِ حقیقی نے مسٹر محمد علی جناح کو قرآن اور اقبال کا مردِ مومن بنانے کے لئے ان تین حضرات سے کام لیا :۔

۱۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ
۲۔ مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ
۳۔ حضرت غازی صاحبؒ

حکیم الامت علامہ اقبال نے قوم کی روحانی، اخلاقی اور سیاسی امراض کی تشخیص کی اور اپنے مشہور خطبہ الہ آباد میں ان کی طرف قوم کو ان الفاظ میں توجہ دلائی :۔

"اس وقت مسلمان دو عوارض کا شکار ہیں، اولاً مسلمانوں میں ایسی شخصیتوں کا وجود نہیں۔ جن کو اعانتِ ایزدی حاصل ہو یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور تقدیر کیا ہے۔ دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا صحت کے ساتھ اندازہ کر سکیں، جن پر قوم کی قوتِ عمل کا انحصار ہے۔ ثانیاً آج متعدد جماعتیں الگ الگ راہ پر گامزن ہیں۔ جس سے قوم کے عام افکار اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا"

گویا اس وقت نہ تو مسلمانوں میں کوئی باخدا رہنما تھا اور نہ قوم میں اتحاد تنظیم

اور یقین تھا۔ جس کا حل علامہ اقبال نے یہ بتلایا کہ ـــــــ

" ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام نے ہی مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیّل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

(خطبۂ صدارت الہ آباد کانفرنس)

علامہ اقبال نے ان امراض کا علاج پاکستان تجویز کیا اور قوم کی قیادت کے لئے قائدِ اعظم کو منتخب کیا۔

اس سلسلہ کی دوسری شخصیت مجدد الملّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی۔ جنہوں نے بھی اسی نوع کا پیغام باقاعدہ طبع کرا کر قائدِ اعظم اور اربابِ مسلم لیگ کو بھیجا جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی درج تھا کہ ـــــــ

" جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی، مسلمانوں کو بجز خدا کے کسی کی امداد کی ضرورت نہیں ہے اور امدادِ الٰہی کی شرط احکام خدا کی پابندی ہے جس کا سینکڑوں برس تک تجربہ کیا جا چکا ہے۔ جب تک مسلمان سچ مچ مذہبی دیوانے بنے رہے۔ دنیا ان کی جوتیوں سے لگی رہی اور جوں جوں اس میں کمی آتی گئی، مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے۔" (آثارِ رحمت صـ۱۹۰)

اہتمامِ تربیت تیسری شخصیّت جس سے قائدِ اعظم بہت متاثر ہوئے۔ حضرت غازی صاحب کی تھی۔ یہ بظاہر تاجر اور آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن تھے، مگر بباطن ابدال تھے اور انہیں دربارِ بغداد سے قائدِ اعظم کی روحانی اصلاح و تربیت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ جہاں قائدِ اعظم کے مورثِ اعلیٰ پیر سیّد عبدالرزاق شاہ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ غازی صاحب کا وہاں سونے کا کاروبار تھا۔ اس زمانہ میں ان کا ۴۸ لاکھ روپے کا بینک بیلنس

تھا۔ سواری کیلئے رولز رائس موٹر رکھی ہوئی تھی۔ جب دربارِ جیلان سے اس روحانی منصب پر فائز ہوئے تو سب کچھ تقسیم کر کے امرت سر آگئے اور تقسیم ہند کے بعد لاہور منتقل ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔ اربابِ مسلم لیگ انہیں اصل نام سے جانتے تھے اور ہم انہیں ان کے مقام سے پہچانتے تھے۔ کیونکہ راقم الحروف بھی ۱۹۴۲ء سے ان کے زیرِ تربیت رہا۔ غازی ان کا لقب تھا اور اسی سے ہم ان کا ذکرِ خیر بشرطِ ضرورت کرتے تھے، مگر ہمیں اس بات کی سخت ممانعت تھی کہ ہم ان کے روحانی مقام کا کہیں انکشاف نہ کریں اور اگر ضرورت ہو تو ان کا نام ظاہر و شائع نہ کریں۔ اسی لئے ان کا جو تذکرہ راقم کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ اس میں ان کا اصل نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس کی بجائے ان کے لقب غازی سے کام لیا گیا۔ ان کے مکتوبات بھی غازی صاحب کے نام سے ان کی حسبِ اجازت ــــــ "اندازِ سخن" ــــــ میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہ صاحب اتنے صاحبِ فراست تھے کہ آنے والے واقعات کی دس دس سال قبل اس طرح اپنی مجلس یا خطوط میں پیش گوئی کرتے تھے، جیسے وہ ان واقعات کے عینی شاہد ہوں چنانچہ ۱۹۲۹ء کے خطوط میں دوسری جنگِ عظیم کے اور ۱۹۳۷ء کے خطوط میں پاکستان کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا وہ دس دس سال بعد ہم نے بچشمِ خود پورا ہوتے دیکھا۔ جس پر آپ کے خطوط جو ــــــ "مشاہدات و واردات" ــــــ اور ــــــ "اندازِ سخن" ــــــ میں شائع ہوئے، شاہدِ عدل ہیں۔

یہ قائدِ اعظم کے بہت بڑے معتمد اور مقرب تھے اور اربابِ مسلم لیگ بسا اوقات انہی کی معرفت اپنی بات قائدِ اعظم سے منوایا کرتے تھے۔ یہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے بڑے منظورِ نظر تھے اور علمائے اشرفیہ کے بڑے مداح اور معتقد! ــــــ غازی صاحب جب بھی ضرورت سمجھتے وہ قائدِ اعظم سے صرف اپنے تاثرات بیان کر دیتے اور وہ جس طرح مناسب و موزوں سمجھتے اس پر عمل کرتے۔ مثلاً سر فیروز خان نون جب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے استعفیٰ دے کر سیدھے قائدِ اعظم کی قیامگاہ پر کوئٹہ پہنچے تو انہوں نے اپنا وزٹنگ کارڈ اندر بھیجا۔ غازی صاحب بھی اس وقت وہیں موجود تھے۔ انہوں نے قائدِ اعظم

سے صرف اتنا کہا کہ ——

"قائدِ اعظم! یہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے آرہے ہیں"

قائدِ اعظم ان کا مطلب سمجھ گئے اور فیروز خان نون سے اس وقت ملنے کی بجائے دوسرے دن ملاقات کا وقت دیا —— قائدِ اعظم کو بھی چونکہ "عارف" کا مرتبہ بخشا گیا تھا اور روحانی دنیا کے دستور کے مطابق عارف کی تدفین ابدال کے ذمہ ہوتی ہے۔ اسی لئے غازی صاحب نے تنِ تنہا قائدِ اعظم کو علامہ شبیر احمد عثمانی، سردار عبدالرب نشتر اور خواجہ ناظم الدین وغیرہ کی موجودگی میں لحد میں اتارا تھا۔

جہادِ کشمیر کا آغاز بھی غازی صاحب کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے لیاقت علی خان سے کہا کہ آپ ہمیں ایک بمبار جہاز دے دیں، جو سری نگر کے ہوائی اڈے کو تباہ کر آئے تاکہ ہندوستان کی فوجیں وہاں نہ اتر سکیں اور پائلٹ کو ہم آزاد علاقہ میں چھپا دیں گے۔ مگر لیاقت علی خان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد غازی صاحب نے اپنے رفقاء کے مشورہ سے محاذِ کشمیر کا کنٹرول لیاقت علی خان کے سپرد کر دیا۔

قائدِ اعظم میں جو بلا کی سیاسی فراست و بصیرت تھی اور جس کے ذریعے انہوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کو نیچا دکھایا۔ وہ سب ان کی نظر کا فیضان تھا۔ اس دن سے آپ نے ہندو مسلم اتحاد کی بجائے اتحاد بین المسلمین کی مہم شروع کر دی۔

دِلی ارمان

ہندو لیڈروں نے قائدِ اعظم کی ہندو مسلم اتحاد کی مساعی جمیلہ کو سراہنے اور ان کا اعتراف کرنے کے باوجود، مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے اتحاد نہ کیا۔ مگر جب آپ نے اتحاد بین المسلمین کی مہم شروع کی تو غیروں کے علاوہ اپنے بھی راستہ میں کانٹے بچھانے کے لئے نکل آئے جس سے صورت حال انتہائی نازک ہو گئی۔ جس کا نقشہ قائدِ اعظم نے ان الفاظ میں کھینچا ——

"آج ملکی حالات کا افق ہمارے خلاف ہے۔ ہم پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کی جا رہی ہیں۔ بہتان باندھے جا رہے ہیں۔ ہمارے بیانات و اعلانات کو

مسخ کر کے اور غلط رنگ دیکر شائع کیا جا رہا ہے اور لیگ کے خلاف
بہت بڑے پیمانہ پر نفرت انگیز اور جھوٹا پروپاگنڈا کیا جا رہا ہے۔ لیگ پر
بے بنیاد الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ جن کا کوئی جواز نہیں۔ وائسرائے اور
برطانوی حکومت کانگرس کے سامنے ہتھیار ڈال چکی ہے۔ حالات کے اس رُخ
نے ہمارے لئے انتہائی نازک اور سنگین صورت پیدا کر دی ہے۔"

آپ جب اپنی ہمشیرہ محترمہ کے پاس بیٹھ کر ان مشکلات و موانعات کا ذکر کرتے تو آنکھیں بھی آپ کے قلبی صدموں اور دلی ارمانوں کی تائید کرنے لگتیں۔ محترمہ فاطمہ جناح اپنی تالیف "میرا بھائی" میں اس راز پر سے یوں پردہ اٹھاتی ہیں کہ ـــــــ

"قائدِ اعظم مجھ سے اکثر کھانے کی میز پر جب کبھی حالات پر تبادلہ خیال کرتے
تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔"

اشکِ رواں "دربارِ اشرفیہ" کی تبلیغی مہم کی بدولت قائدِ اعظم پر مذہبی رنگ غالب آ چکا تھا۔ آپ کے روحانی مربی غازی صاحب کی صحبت نے سونے پر سوہاگے کا کام کیا تھا۔ جس کی وجہ سے قائدِ اعظم کی توجہ الی اللہ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اور آپ سیاسی فتوحات کے لئے اکثر دربارِ الٰہی میں سربسجود رہتے تھے اور از راہِ خشیت رو رو کر گڑگڑا گڑگڑا کر قوم کی فلاح و ترقی کے لئے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

ایک روز بطلِ حریت مولانا حسرت موہانی ایک بہت ضروری کام کے سلسلہ میں علی الصبح قائدِ اعظم کی کوٹھی پر جا پہنچے۔ ان کا بیان ہے کہ:۔

"کام کی اہمیت کے پیشِ نظر میں ملازم کے روکنے کے باوجود قائدِ اعظم کے کمرے
تک جا پہنچا تو دیکھا کہ قائدِ اعظم سجدے میں گرے ہوئے ہیں اور بِلک بِلک کر
رو رہے ہیں اور نہایت بیقراری کے ساتھ دعا مانگ رہے ہیں۔ میرے
تصور میں ہر وقت وہی تصویر اور وہی آواز رہتی ہے۔"

(تعمیرِ پاکستان اور علماءِ ربانی ص۱۰۳)

تنہائی کے عالم میں اشکوں کی یہ روانی بہت سے مقربین نے دیکھی۔

جن دنوں مشرقی پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ ان دنوں پاکستان کے مخالفوں نے قائدِاعظم پر یہ مہلک نفسیاتی حملہ کیا کہ اس سارے خون خرابے کی ذمہ داری قائدِاعظم پر عائد ہوئی ہے۔ اگر وہ پاکستان طلب نہ کرتے تو نہ لاکھوں انسان خاک و خون میں تڑپتے نہ عورتوں کی عزتیں اور عصمتیں برباد ہوتیں، نہ معصوم بچوں کو سنگینوں پر چڑھا کر ان کا جلوس نکالا جاتا۔ ان دشمنانِ ملت نے اتنی شدت کے ساتھ یہ پروپاگنڈہ کیا کہ قائدِاعظم پریشان رہنے لگے۔ آپ کو خفیف سی حرارت رہنے لگی۔ آپ آخرت کے خوف اور مواخذہ سے اکثر سربسجود ہو کر رو رو کر بارگاہِ رب العزت سے معافی کے طالب ہوتے۔ ایک روز علامہ شبیر احمد عثمانی (جن کو بلا تکلف آپ کے کمرہ میں جانے کی اجازت تھی) ایک ایسے وقت میں آپ کے کمرے میں جا پہنچے۔ جب قائدِاعظم سجدے میں پڑے رو رہے تھے۔ علامہ صاحب قریب پہنچے تو قائدِاعظم اٹھ کر ان سے لپٹ گئے اور آبدیدہ حالت میں ان سے سوال کیا ــــــــ

"کیا مسلمانوں کے قتلِ عام کا میں ذمہ دار ہوں"؟

علامہ موصوف نے پرزور الفاظ میں فرمایا "ہرگز نہیں" اور کافی دیر دلائل و شواہد سے اس صریح بہتان کی تردید کی۔ جس سے قائدِاعظم کی تسلی ہوگئی!

یقین و ایمان اسلامی تعلیمات پر قائدِاعظم کا اتنا پختہ یقین و ایمان تھا کہ جب بھی کوئی مشکل پیش آتی یا پریشان کن صورتِ حال پیدا ہوتی تو آپ جہاں اسلامی تعلیمات کے مطابق دوسروں کو صبر و تحمل کی تلقین فرماتے اور اس پر خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات سناتے۔ وہاں خود بھی دوسروں کی تکالیف سن کر آب دیدہ ہو جاتے۔

۱۹۴۶ء میں جب صوبہ بہار میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ کر پاکستان کی بنیادیں کھودیں تو وہاں سے ایک وفد ہندوؤں کی بربریت اور سفاکیت کی درد ناک داستان سنانے۔ قائدِاعظم کی خدمت میں پہنچا۔ ان کی جگر خراش داستان سن کر آپ

کی رقیق القلبی نمایاں ہوگئی ۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ۔ آپ نے بڑی ہمت سے ان کو ضبط کیا اور گلوگیر آواز میں وفدِ مذکور کو یہ یقین دلایا کہ ــــــ

"شہیدوں کا خون انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائے گا اور اس کا بدلہ خدائے عظیم الشان دے گا۔"

چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ کا یقینِ محکم بارآور ہوا اور ہند و پاکستان کی تقدیر کا فیصلہ آپ کی نیک تمناؤں کے مطابق ہو کر رہا ۔

فکرِ پاکستان ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے قائدِ اعظم کو جنگ پاکستان جیتنے کی مبارک باد دینے گئے ۔ بدوران گفتگو قائدِ اعظم نے فرمایا:۔

"مولانا مجھے تو اس وقت بڑا فکر سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم کا ہے ۔ اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔"

مولانا شبیر احمد عثمانی نے کہا کہ ــــــ

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ پاکستان اس ریفرنڈم میں کامیاب ہو جائے ؟"

اس پر قائدِ اعظم آب دیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ ــــــ

"سرحد پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور سلہٹ کا علاقہ بھی مشرقی پاکستان کے لئے ایسا ہی اہم ہے ۔ میں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان اس ریفرنڈم میں کامیاب ہو۔"

چنانچہ ان فدایانِ اسلام کی بدولت حق تعالیٰ نے آپ کی یہ تمنا بھی پوری کردی ۔ پیکرِ صبر و ثبات قائدِ اعظم نے اپنوں کے غم میں تو کبھی آنسو نہ بہائے مگر قوم کے غم نے آپ کو رلا دیا ۔ آپ کے آخری آنسو اس وقت نکلے جب اس دنیا سے رخصت ہونے سے چند روز قبل آپ بھرّائی ہوئی آواز میں یہ فرما رہے تھے کہ ــــــ

"گھبراؤ نہیں ! خدا کی ذات پر بھروسہ رکھو ۔ اپنے ذاتی فائدے کو قومی اور ملکی مفاد پر ترجیح نہ دو ۔ خدا تمہاری رہنمائی کرے گا۔"

اثرِ قرآن

قائدِاعظم پر جب مذہبی رنگ چڑھا تو اس کی بدولت آپ میں قرآنی ذوق پیدا ہو گیا۔ جب بھی موقع ملتا آپ قرآن فہمی میں مصروف رہتے اور اگر کوئی ایسا مقرب آجاتا جسے قرآنی علوم پر عبور ہوتا تو اس سے بھی قرآن کریم کے اہم مقامات پر بات چیت کرتے۔ غلام احمد پرویز کا بھی آپ کے ہاں آنا جانا تھا۔ جو انگریزی حکومت کے سیکرٹریٹ میں ملازم تھے اور انہیں قرآن فہمی کا بھی ادعا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ——

"میں جب بھی حاضر ہوتا۔ پیش آمدہ اہم معاملہ کے بعد، قرآن کریم کے کسی نہ کسی اہم مقام پر بات چیت شروع ہو جاتی۔ میں نے ان جیسا ذکی الفہم انسان بہت کم دیکھا ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ —— "خارے دیدو احوال چمن گفت!" —— ذرا سے نکتہ سے پوری کی پوری کیفیت فوراً سمجھ لیتے تھے۔

یہ غالباً ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے کہ ایک نشست میں، میں نے قرآن مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حضور نبی کریمؐ کی ساری زندگی اپنے مقصد کے حصول میں جانگداز مشقتیں اٹھاتے گزر گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضورؐ کے قلبِ مطہر میں یہ حسین و معصوم سی آرزو ابھری کہ بارِالٰہا! میں اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے دیکھ سکوں گا یا میری زندگی اسی تگ و دو میں گزر جائے گی؟

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا ——

ترجمہ (۱۳/۴۰) جو کچھ تمہارے پروگرام کے مخالفین سے کہا جا رہا ہے۔ وہ تیری زندگی میں تیرے سامنے آجائے یا اس سے پہلے ہی تیری وفات ہو جائے۔ اس سے تجھ کو کوئی سروکار نہیں۔ تیرا کام اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے۔"

میں رواداری میں یہ کچھ کہہ تو گیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے (ان کی آنکھوں میں آنسو، بہت کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے) یہ دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پر یہ کیفیت کیوں طاری ہو گئی۔ فرمایا کہ ـــــــ

"میں نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستی کے لئے بھی ذرا سی رو رعایت نہ رکھی اور صاف کہہ دیا کہ یہ ہمارے قانون کے مطابق واقع ہو گا۔ خواہ تمہاری زندگی میں ہو اور خواہ اس کے بعد ـــــــ تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ وہ ہماری خاطر کیوں اپنے قانون میں رعایت برتنے لگا۔ اس لئے معلوم نہیں ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے یا نہیں؟"

اس پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے نادانستہ کیا غلطی ہو گئی۔ میرے مضراب نے ان کے کس تار رگِ جاں کو چھیڑ دیا۔ میں نے اس احساس کی شدت کو کم کرنے کے لئے کہا کہ نہیں! حضورؐ کے مقصد کا حصول حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہی ہو گیا تھا۔ فرمایا کہ ـــــــ

"یہ الگ بات ہے لیکن خدا نے اپنے قانون میں تو کوئی رعایت نہیں برتی تھی"

یہ کہکر وہ پھر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا ـــــــ

"عزیزم! جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے کوئی غلط مفہوم نہ لینا۔ قانونِ خداوندی کے بے لچک ہونے کے ساتھ ہمیں اپنے سامنے اسوۂ رسول اللہ رکھنا چاہیئے۔ حضورؐ نے اس جواب ملنے کے بعد اپنی تگ و تاز میں کسی قسم کی کمی نہیں کر دی تھی۔ ہمیں بھی اپنی جدوجہد بدستور جاری رکھنی چاہیئے۔ ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم ہے۔"

مطالعہ قرآن

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اُس دور کے دستور کے مطابق سب سے پہلے قائدِاعظم کو بچپن میں قرآن مجید پڑھایا گیا، لیکن آپ کی دینی تعلیم کا کوئی خاص اہتمام نہ کیا گیا تھا۔ خاندانی طور پر آپ اسماعیلی عقیدہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن جس دن سے آپ ہز ہائی نس

سر آغاخان کی امامت سے منکر ہوئے، اس عقیدہ کے اثرات کے تحت آپ نے اثنا عشری مسلک اختیار کر لیا۔ لیکن ملک و ملت کی قیادت و امارت سنبھالنے کے بعد حکیم الامت علامہ اقبال کی مساعی جمیلہ۔ مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی کی دینی اور حضرت غوث اعظمؒ کے دربار بغداد کے مرد غازی کی روحانی تعلیم و تربیت نے آپ کی کایا پلٹ دی۔ آپ نے سوادِ اعظم یعنی اہلِ سنت کا مشرب اختیار کر لیا۔ کتاب و سنت کے اتباع میں خود کو شیعہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بقول نواب صدیق علی خان ——

"تامرگ ایک اچھے اور حقیقی مسلمان کی حیثیت سے خود کو ایسی بلندی پر رکھا جہاں کسی عقیدہ کا گزر نہیں تھا" (بے تیغ سپاہی)

سرکارِ دو جہاںؐ کی نظرِ کرم اور اہل اللہ کی دینی و روحانی تعلیم و تربیت نے قائدِ اعظم کے دل میں کلامِ ربانی اور ارشاداتِ نبویؐ کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا۔ آپ نے ان کا بغور مطالعہ شروع کر دیا۔ جس نے آپ کی دینی بصیرت اور اسلامی شعور میں رہی سہی کمی پوری کر دی۔ اس کا تذکرہ آپ نے خود اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد دکن میں طلبار کے اس سوال کے جواب میں کیا کہ ——

"مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟" —— تو آپ نے فرمایا ——

"میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو۔ یا معاشرتی و سیاسی ہو یا معاشی ہو۔ غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو" (حیاتِ قائدِ اعظم ص۴۲۷)

یہ قرآن و حدیث کے مطالعہ اور دینی اور روحانی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ قائدِ اعظم میں وہ تمام صفاتِ مومنانہ پیدا ہو گئیں۔ جو قرآنِ کریم نے ایک ایک کر کے گنوائی ہیں اور جن کی بدولت آپ ہر محاذ پہ کامیاب ہوتے چلے گئے اور دنیا کی کوئی طاقت آپ کے لیے سنگ راہ نہ بن سکی۔

فرقہ بندی سے نفرت

آپ کو فرقہ بندی اور فرقہ پرستی سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں آپ نے "اینگلو عربک کالج" دہلی کے ہال میں خواتین و طالبات سے خطاب کرتے ہوئے ببانگِ دہل فرمایا کہ ——

"اب مسلمانوں کی نجات اس میں ہے کہ وہ متحد ہو جائیں۔ وہ شیعہ، سنی اور وہابی کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ دیں۔ وہ صوبائی تعصب کو بھی خیرباد کہہ دیں۔ بعض مسلمان کہتے ہیں کہ وہ پنجابی ہیں اور بعض اپنے تئیں بنگالی کہتے ہیں۔ ایسا طریقِ فکر مسلمانوں کے لئے سخت مصیبت کا باعث بنے گا۔ ہم صرف اسلام کے خادم ہیں" (نوائے وقت لاہور، نومبر ۱۹۴۶ء)

آپ فرقہ بندی سے اتنے متنفر تھے کہ ۱۹۴۶ء میں جب ایک مرتبہ آپ کو جمعہ کی نماز لندن کے مشرقی حصہ میں پڑھنی پڑی تو سوال پیدا ہوا کہ کس مسجد میں نماز پڑھی جائے۔ جناب ممتاز حسن مینجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان لکھتے ہیں ——

"قائدِ اعظم نے فرمایا کہ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں کہ جو کسی فرقہ سے خاص نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔ چنانچہ آپ نے ایک ایسی مسجد منتخب کی جہاں سارے کا سارا مجمع غریب مسلمانوں کا تھا۔ لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں کی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے آگے کی صف میں بیٹھ سکیں۔ مگر انہوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا کہ ——
میں دیر سے آیا ہوں اور کسی جگہ کا مستحق نہیں ہوں"

(ماہِ نو کراچی دسمبر ۱۹۵۴ء)

یہ سب اسی دینی تربیت کا اثر تھا جو آپ نے علماء دربارِ اشرفیہ سے حاصل کی تھی۔ اس سے قبل آپ کو "میمن چیمبر آف کامرس" بمبئی کی طرف سے ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس کے جواب میں بھی آپ نے یہی فرمایا تھا کہ ——

"میں ان جماعتی ناموں کو بالکل ناپسند کرتا ہوں۔ آپ کو چاہیئے کہ اپنا نام مسلم چیمبر آف کامرس رکھیں۔ اسلئے کہ اسلام ہی ہمارا طرۂ امتیاز ہے"۔ (عظمتِ رفتہ صفحہ ۴۸)

مقامِ فاروق اعظمؓ

قائدِاعظم نے اگرچہ شیعت ترک کرکے کتاب وسنت کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کردی تھی، مگر آپ نے اپنے عقیدہ کی تبدیلی کا اعلان ضروری نہ سمجھا تھا۔ اس لئے بعض خوش فہم آپ کو شیعہ سمجھتے تھے اور بعض شک وشبہ میں مبتلا تھے اور اصل حقیقت الم نشرح کرانے کی جستجو میں لگے ہوئے تھے۔

قائدِاعظم عام طور پر طلبار کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یونین ہال (ڈرائنگ روم) میں ملنے کا وقت دیتے تھے۔ اکثر صاحبان آپ سے وہیں ملتے۔ سوالات کرتے اور تشفی بخش جواب پاتے۔ اہلِ تشیع میں سے ایک صاحب کو یہ بات گراں گزر رہی تھی کہ قائدِاعظم اپنے عقیدہ کو کیوں چھپائے رکھتے ہیں اور اسے ظاہر کیوں نہیں کرتے —— اس لئے انہوں نے اس بات کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے قائدِاعظم پر حضرت فاروق اعظمؓ کے متعلق ایک ایسا سوال کیا۔ جس سے ان کی ذات وصفات پر حرف آتا تھا۔ قائدِاعظمؒ فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ اور ان سے یوں مخاطب ہوئے ——

" TELL ME, MY BOY, IF YOU TAKE HAZRAT OMARؓ OUT OF THE ISLAMIC HISTORY, WHAT IS LEFT OF IT "

یعنی اگر آپ تاریخِ اسلام سے حضرت عمرؓ کو خارج کردیں، تو پھر آپ کے پاس باقی رہ ہی کیا جاتا ہے؟ یہ ایک ایسا جملہ تھا۔ جسے سن کر سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور ہال میں سناٹا چھا گیا۔

قائدِاعظم چونکہ ایک حقیقت پسند انسان تھے اور تاریخ اسلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس لئے آپ متعصب، فرقہ پرست، تفرقہ پسند لوگوں کی طرح تاریخی حقائق کو قطعاً نظرانداز نہیں کرتے تھے اور نہ چشم پوشی سے کام لیتے تھے بلکہ ہمیشہ یہی فرماتے رہتے تھے کہ ——

"مسلمانوں کی وحدت کی بنیاد ایک خدا، ایک کتاب اور ایک رسول پر ہے

اس لئے مسلمان بھی فرقہ بندی سے بالاتر ہو کر اتفاق و اتحاد سے رہیں اور دنیا کے سامنے خلافت راشدہ کے دور کا نمونہ پیش کریں۔ تاکہ پاکستان اسم بامسمیٰ ثابت ہو سکے۔"

ایمان و ایقان قائدِ اعظم قرآن اور اقبال کے مردِ مومن تھے۔ آپ میں وہ تمام صفات موجود تھیں۔ جو قرآن نے ایک مردِ مومن کی گنوائی ہیں۔ مطالعہ قرآن و حدیث اتباعِ کتاب و سنت اور پابندئ صوم و صلوٰۃ آپ کے معمولات میں داخل تھے ـــــ قائدِ اعظم کے ایک سابق اے۔ ڈی۔ سی جناب احمد محی الدین کا بیان ہے کہ ـــــ

"قائدِ اعظم نماز پڑھتے تھے۔ وہ پختہ عقیدہ کے مسلمان تھے اور فرقہ داریت پر یقین نہ رکھتے تھے۔ جن دنوں خاکسار تحریک نے بیلچہ بردار رضاکاروں کو چنے اور گڑ دے کر کلکتہ کی جانب پیدل مارچ کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ان دنوں قائدِ اعظم علی گڑھ تشریف لائے۔ ان کے اعزاز میں یونیورسٹی ٹینس لان کورٹ میں سوئمنگ پول کے نزدیک پارٹی دی گئی۔ تقریب کے اختتام پر جیسے ہی اذان دی گئی، قائدِ اعظم فوراً ادھر تشریف لے گئے اور طلبار کی صف میں کھڑے ہو کر نمازِ مغرب ادا کی۔

یہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ قائدِ اعظم شیروانی صاحب کے بنگلہ میں مقیم تھے۔ تین بجے شب کے قریب فرسٹ فلور پر مسٹر جناح کے کمرے سے ایک زوردار آواز آئی۔ میں خود برابر والے کمرہ میں مقیم تھا۔ یہ آواز سن کر میں وہاں گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ محمد علی جناح نیت باندھ کر نمازِ تہجد ادا کر رہے ہیں اور پانی کی ایک بوتل ٹوٹی پڑی ہے۔ پتہ یہ چلا کہ اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے سربسجود ہونے کے لئے اٹھے تو کسی طرح بوتل سے ان کا ہاتھ ٹکرا گیا اور وہ گر کر چکنا چور ہو گئی۔

انہوں نے شعبہ جغرافیہ کے طلبہ کی ایک استقبالیہ دعوت میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ دس کروڑ مسلمانوں کے لیڈر ہیں اور فرقہ داریت

سے بالاتر ہیں"۔ (روزنامہ جنگ۔ قائداعظم ایڈیشن اا ستمبر ۱۹۷۶ء)

آہ وزاری | خوف وخشیت کا یہ عالم تھا کہ بقول مولانا حسرت موہانی، نماز پنجگانہ کے علاوہ آپ کافی کافی دیر بند کمرہ میں سر بسجود رہتے اور بلک بلک کر آہ وزاری کے ساتھ دعا کرتے تھے۔ اس سے مولانا موصوف اتنے متاثر ہوئے کہ وہ اکثر اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے رہتے تھے کہ:۔

"میرے تصور میں ہر وقت قائداعظم کی وہی تصویر اور وہی آواز رہتی ہے"۔

آپ پر مذہبی رنگ اتنا غالب تھا کہ آپ کی ہر تحریر اور تقریر اسلام کے پیغام کی حامل ہوتی تھی۔ امارت و وجاہت، عزت وعظمت، محبوبیت ومقبولیت اور اختیار و اقتدار کے باوجود آپ ہمیشہ نظر اسباب کی بجائے مسبب الاسباب پر رکھتے تھے اسی لئے ہر میدان اور ہر محاذ پر مولا کریم کی دستگیری آپ کے شامل حال رہتی تھی اور تن تنہا نامور سورماؤں کو چشم زدن میں پچھاڑ دیتے تھے۔ ہندو اور انگریز مل کر بھی قائداعظم کو شکست نہ دے سکے۔ بلکہ اس تنِ واحد سے شکست کھا گئے اور پاکستان دیکر جان چھڑائی۔

خدا پر بھروسہ | متوکل علی اللہ اتنے کہ پاکستان کے اولین یوم آزادی پر جب لارڈ مونٹ بیٹن نے بخوفِ جان کراچی آنے سے انکار کر دیا اور قائداعظم کو لکھا کہ ———

"اس موقعہ پر سکھوں نے آپ کو بم سے اڑا دینے کا منصوبہ مکمل کر رکھا ہے ایسے حالات میں نہ آپ کے لئے جلوس نکالنا مناسب ہے اور نہ میرے لئے اس میں شرکت!" (عہد لارڈ مونٹ بیٹن)

تو قائداعظم نے انہیں ان الفاظ میں تسلی دی کہ ———

"گھبراؤ نہیں! خدا پر بھروسہ کر کے آجاؤ، اللہ تعالیٰ بہتری کرے گا"۔

چنانچہ وہ آئے اور قائداعظم انہیں کھلی کار میں بٹھا کر اور لاکھوں انسانوں کے پرجوش ہجوم میں سے بخیر وخوبی گورنمنٹ ہاؤس تک لے آئے۔ جس سے لارڈ مونٹ بیٹن بہت

متاثر ہوتے۔

دوسری طرف قائدِ اعظم اتنے نرم دل تھے کہ جب بھی کسی کو دکھ اور تکلیف میں دیکھتے تو پریشان ہو جاتے۔

قائدِ اعظم کے ایمان و ایقان کی یہ حالت تھی کہ آپ ہر وقت خدا تعالیٰ کو اپنی جان کا محافظ سمجھتے تھے اور کسی انسان کو اپنی حفاظت کے لئے رکھنا اپنے ایمان و ایقان کی توہین تصور کرتے تھے۔

سنت اللہ ان ناقابلِ تردید شواہد کی موجودگی میں اگر کسی کو قوم کا یہ ناخدا، باخدا نظر نہ آئے تو اسے اس کی شپرہ چشمی کی وجہ سے معذور سمجھنا چاہیئے۔

تاریخ عالم اس بات کی شاہدِ عدل ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی سے دینِ اسلام کی خدمت لینا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے دین و دانش بخشتا ہے۔ پھر فہم و فراست سے مالا مال کرتا ہے۔ اس کی نظر میں وسعت اس کے قلب میں خشیت اس کے نطق میں اثر و تاثیر اور عوام و خواص میں اس کے لئے محبت و عزت، عظمت و مقبولیت پیدا کر دیتا ہے۔ دشمنوں اور مخالفوں کے دِلوں میں اس کی ہیبت بٹھا دیتا ہے۔ حاسدین و معاندین و ناقدین کے حوصلے پست کر دیتا ہے۔ اسی لئے جب ہندوستان میں ایک اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالنے اور اس میں نظامِ دین رائج کرنے کے لئے مغرب زدہ طبقہ سے قائدِ اعظم کو منتخب کیا گیا تو ان میں مذکورہ بالا تمام صفات پیدا کر دی گئیں اور انہی کی بنا پر آپ نے پاکستان کی تاریخی جنگ بلا تیغ و تفنگ لڑ کر جیتی۔

فرقہ پرستی سے نفرت ۲۲ جنوری ۱۹۴۵ء کو حبیب فیملی (حبیب بنک لمیٹڈ والوں) نے بچوں کے ایک یتیم خانہ کا امدادی جشن منایا۔ یتیم خانہ کی تعمیر و ترقی کے لئے خوجہ برادری کے ۲۲ حضرات نے ۲۵، ۲۵ ہزار روپیہ عطیہ دیا۔ اس لئے عام چندہ نہ کیا گیا۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی قائدِ اعظم تھے۔ یہ جشن صبح دس بجے سے دوپہر ڈیڑھ بجے تک رہا۔ قائدِ اعظم

نے بڑی دلچسپی سے خوجہ بچیوں کے خانہ داری کے کارنامے دیکھے اور اس کے بعد آپ نے ارباب ثروت سے خطاب کرتے ہوئے ان کے لئے مندرجہ ذیل تاثرات کا اظہار کیا ــــ

"بیکس یتیموں کو خیرات دینے سے زیادہ اور کوئی سخاوت نہیں ۔ ہم سب کو دولت پیاری ہوتی ہے ۔ ہر شخص جتنا دولت جمع کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے اتنا دینے کا نہیں ہوتا ۔ تمہارے پاس دولت ہے تم اس کا کیا کرو گے ؟ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں پھر کس دن کے لئے دولت جمع کر رکھی ہے ؟ اس دولت کو اپنی زندگی میں نیک کاموں پر لگاؤ ۔ تاکہ قوم اور برادری کی تعمیر و ترقی ہو سکے ہمیں اسلام پر صحیح معنوں میں عامل ہونا چاہیئے اور اگر ہم مذہب اسلام کو ہر دلعزیز بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ دیرینہ جھگڑے اور مناقشات ترک کر دیں اور بے جا جذبات کو پاس نہ پھٹکنے دیں ۔ ہم خوجہ، بوہرہ وغیرہ فرقہ وارانہ نام چھوڑ کر ایک قوم مسلمان بن جائیں ۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ خوجہ، بوہرہ اور میمن یتیم خانوں کا وجود بھی نہ ہوگا ۔ ہمیں اپنی طبیعتوں، ذہنیتوں اور خیال میں انقلاب پیدا کرنا چاہیئے ۔" (قائدِ اعظم اور ان کا عہد صہ ۱۳۲ - ۱۳۶)

وائسرائے کا مشیر مسٹر ہڈسن لکھتا ہے :۔

"جناح کی خلوت پسندی، کم آمیزی، بات چیت میں اختصار اور پارلیمانی سیاست میں مدافعانہ مہارت، یہ سب باتیں، اس کے حق میں جاتی ہیں۔ لیکن ایک عجیب بات جس کا اس نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا وہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں بھی اس کے کسی خاص مسلک یا فرقے مثلاً سُنّی یا شیعہ، کسی علاقے، کسی گروہ مثلاً روساء پنجاب سے کوئی ترجیحی تعلقات نہ تھے، بایں ہمہ وہ بیک وقت سب کے درمیان سب سے جدا اور سب کا محبوب رہنما بن گیا اور ساری قوم کو ایک لڑی میں پرونے میں کامیاب رہا ۔"

قائدِ اعظم نے جو مقبولیت عامہ حاصل کی، وہ اور کسی لیڈر کو نصیب نہ ہوئی اور کانگرسی لیڈر دریا کے بہاؤ کے ساتھ چل کر جو گوہر مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہے ۔ وہ اس

دانائے راز نے دریا کے بہاؤ کے خلاف چل کر حاصل کرلیا۔

شیعہ فرقہ واحد حسین خان علیگ نجیب آبادی طالب علمی کے زمانہ سے علی گڑھ میں اتنے مصروف تھے کہ علی گڑھ کے جن مخصوص طلباء کو تین مرتبہ وائسرائے ہند اور دو مرتبہ نظام حیدرآباد نے شرف باریابی بخشا۔ ان میں واحد حسین خان بھی شامل تھے۔ جواہر لعل نہرو اور مسٹر کرپلانی سے ان کی ذاتی شناسائی تھی۔ حافظ ابراہیم کے الیکشن میں مسلم لیگ کی طرف سے یہ سرگرم عمل رہے۔ جس کی وجہ بدوران الیکشن مولانا شوکت علی مسلم لیگ کا دفتر چھوڑ کر معہ مولانا حسرت موہانی، واحد حسین خان کے ہاں جا رہے۔ جب مسٹر جناح وہاں بسلسلہ الیکشن تشریف لے گئے تو وہ بھی ان کے ہاں ٹھہرے۔ ۱۹۳۰ء میں جب قائد اعظم علی گڑھ آئے تو واحد حسین خان کو بھی دوسرے خاص لڑکوں کے ساتھ چائے پر مدعو کیا تھا۔

عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ (رجسٹرڈ) ملتان کے خصوصی معاون واحد حسین خان علیگ اپنے تازہ گرامی نامہ ۵ ر اکتوبر ۸۵ء میں راولپنڈی سے لکھتے ہیں:-

"بجنور کی سیٹ پر مسلم لیگ نے حافظ ابراہیم کو چیلنج کیا۔ دو بار الیکشن لڑا گیا۔ جس میں مسلم لیگ ہار گئی اور ابراہیم جیت گئے۔ اس موقعہ پر مسٹر جناح، مولانا شوکت علی، جمال میاں، حامد بدایونی میرے ہاں نجیب آباد میں مہمان رہے۔ مولانا شوکت علی بڑے منہ پھٹ تھے۔ انہوں نے کھانے کی میز پر مسٹر جناح سے سوال کیا کہ مسلمان آپ کو شیعہ کہتے ہیں! تو مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اول تو میں کوئی علماء میں سے نہیں ہوں۔ میں مسلمانوں کا مقدمہ لڑ رہا ہوں۔ جو سپرد وغیرہ نہیں لڑ سکتے۔ دوسرے شیعہ کب سے نکلے ہیں؟ پیغمبر اسلامؐ۔ حضرت علیؓ۔ امام حسینؑ میں سے کسی نے شیعہ مذہب نہیں بنایا۔ نہ ظاہر کیا۔ لہٰذا میں مسلمان ہوں۔ یہ فرقہ بعد کی پیداوار ہے۔"

انکارِ شیعیت قائد اعظم کی دینی اور روحانی تربیت کرنے والے چونکہ ماموں من اللہ

تھے۔ اس لیے وہ اپنے فریضہ کی ادائیگی کی آجکل کی طرح پبلسٹی نہ کرتے تھے۔ نہ ہی قائدِاعظم نے کبھی اپنے عقائد کی تبدیلی کے سلسلہ میں کسی بیان کی ضرورت سمجھی اس لئے عوام و خواص اس معاملہ میں بالکل لاعلم تھے اور وہ آپ کو بدستور شیعہ سمجھتے تھے۔

۱۹۴۴ء میں بدقسمتی سے لکھنؤ میں دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کو سے لڑا رکھا تھا اور مدح و قدح صحابہ کی تحریک چل رہی تھی۔ دوسری طرف گاندھی، جناح مذاکرات جاری تھے، گاندھی جی نے ایک ملاقات کے لئے ۲۱ ماہِ رمضان کی تاریخ مقرر کر کے قائدِاعظم کو اطلاع بھیجی، آپ نے ایک اخباری بیان کے ذریعے اس دعوت نامے کا یہ جواب دیا کہ ــــــ

"چونکہ یہ حضرت علیؓ کی شہادت کا دن ہے۔ اس لئے اس روز گفتگو ممکن نہیں۔"

یہ بیان پڑھ کر لکھنؤ سے مولانا ظفر الملک نے قائدِاعظم پر یہ الزام دھرا کہ شیعہ عقیدہ کو مسلمانوں سے منسوب کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ اس اعتراض کا قائدِاعظم نے اپنے روایتی انداز میں یہ مختصر سا جواب دیا کہ ــــــ

"مجھے علم نہیں تھا کہ آپ جیسے کوتاہ نظر مسلمان ہنوز موجود ہیں۔ یہ صرف شیعہ عقیدہ کا سوال نہیں ہے۔ حضرت علی خلیفہ چہارم تھے۔ رمضان کی اکیس تاریخ کو بے شمار شیعہ و سنی مسلمان بلا لحاظ عقائد یوم شہادت حضرت علی مناتے ہیں۔"

(بحوالہ تیغ سپاہی صفحہ ۱۴۱)

اس جواب سے آپ کے شیعہ ہونے سے متعلق لوگوں کا یقین متزلزل ہو گیا۔

قائدِاعظم کے قیام کوئٹہ کے دوران ایک شیعہ وفد آپ سے ملنے گیا اور حضرت غازی صاحب کی موجودگی میں جب اس وفد کے امیر نے یہ کہا کہ آپ ہمارے فرقہ میں سے ہیں ــــــ تو آپ نے فی الفور اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ــــــ

" NO, I AM MUSLIM "

قائدِاعظم کے قیام کوئٹہ کے زمانہ میں غازی صاحب اکثر کوئٹہ رہا کرتے تھے۔ غازی صاحب نے اپنے مکتوبِ گرامی مورخہ ۱۸/۲، بنام راقم الحروف میں لکھا کہ ــــــ

"کوئٹہ میں "یوم حسین" پر شیعہ حضرات قائدِاعظم کو لینے آتے تھے، آپ نے

انکار کیا اور فرمایا کہ ـــــــ مسلمانوں میں ایسی مجالس ہونی چاہئیں۔ جہاں تفرقہ نہ ہو اور آپ کے ہاں ایسی مجالس ہوتی ہیں۔ جن کو میں پسند نہیں کرتا پرانی قربانیوں کا ذکر اچھا ہے۔ لیکن اب فائدہ اقوم کو اب جو مشکلات درپیش ہیں، ان کا حل سوچنا چاہئے اور یہ بات مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق میں ہے"

(اندازِ سخن صد ۶۹)

کیونکہ آپ اتحاد کو ایک ایسی قوت سمجھتے تھے جو ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ چنانچہ وہ وفد مایوس ہو کر واپس چلا گیا کہ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

انکشافِ حقیقت حق تعالیٰ نے اس عظیم انسان کو ایسی فہم و فراست عطا کی تھی کہ مستقبل آئینے کی طرح آپ کے سامنے رہتا تھا، قوم کی اخلاقی کمزوریوں اور خودغرضیوں کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو آپ کی نظروں سے اوجھل ہو۔ آپ کے اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے پر پیدا ہونے والے مسائل کا بھی آپ کو شدید احساس تھا۔ جن میں سرِفہرست آپ کے تبدیلیٔ عقیدہ کا مسئلہ تھا۔ جس کا آپ وقتاً فوقتاً اپنے قول و کردار سے تو اظہار کرتے رہے، مگر اس کے لئے آپ نے کوئی باقاعدہ اعلان نہ کیا تھا ـــــــ اس لئے آپ کو احتمال تھا کہ میرے مرنے کے بعد میری تجہیز و تکفین اور تدفین پر ممکن ہے فرقہ پرست کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیں ـــــــ اس لئے اس خطرہ کے انسداد کے لئے آپ نے اپنے تبدیلیٔ عقیدہ کی بنا پر اپنا وصیت نامہ لکھ چھوڑا تھا۔

آپ کی وفات کے بعد جب تجہیز و تکفین کا مرحلہ پیش آیا تو مذکورہ بالا خطرہ متشکل ہو کر سامنے آ گیا ـــــــ آپ کے شریکِ جنازہ عبداللطیف سیٹھی لکھتے ہیں کہ ـــــــ

"شیعہ حضرات نے لیاقت علی خان سے استدعا کی کہ انہیں اہلِ تشیع کے طریق کے مطابق قائدِاعظم کی میت کی تکفین و تدفین کرنے کا موقع دیا جائے۔ لیاقت علی بھی اپنی نیم تشیعیت کے باوجود بہت پریشان تھے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہوگا۔ آخر انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ محترمہ فاطمہ جناح سے مشورہ کیا جائے۔ شیعہ

حضرات مادرِ ملت کے پاس گئے اور استدعا دہرائی۔ محترمہ نے قائدِ اعظم کی وصیت کے کاغذات میں ایک فائل تلاش کرلی، جس میں صراحت کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ —— وفات کے بعد ان کا جنازہ عام مسلمانوں کی طرح ہو اور جنازہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی پڑھائیں —— اس وصیت نے یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل کردیا اور ساتھ ہی قائدِ اعظم کی دوراندیشی کی داد بھی سب کو دینا پڑی کہ انہیں احساس تھا کہ اس قسم کے مسائل بھی عین ماتم کے وقت پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور انہوں نے پہلے ہی وصیت نامہ میں یہ مسئلہ حل کرکے رکھ دیا تھا۔ قائدِ اعظم کی بڑی خوبی یہ تھی کہ قوم کو انکی قیادت میں کسی موقع پر بھی کبھی کوئی مایوسی نہ ہوئی اور مرنے کے بعد اگر ان کے مسلک کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جاتا تو قوم کی ماتم گساریوں میں بہت ہی بُری بات ہوجاتی لیکن ان کی وصیت کی وجہ سے قوم میت کے تقدس کی تمام رسومات نہایت ہی منظم طریق سے انجام کو پہنچا سکی۔ یہ سب کچھ قائدِ اعظم کی عقل و فراست اور سرعتِ ذکاء و دوراندیشی کی وجہ سے تھا —— بہت کم لوگ دنیا میں ایسے پیدا ہوتے ہیں جو قائدِ اعظم کی سی عقل و دانش رکھتے ہوں۔"
(نوائے وقت ۱۲، اکتوبر ۱۹۷۵ء صد کالم ۴، ۵۔)

چنانچہ حسب وصیت، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے آپ کی نماز جنازہ مسنون طریق پر پڑھائی اور ان کی ہمشیرہ محترمہ کی موجودگی میں ان کی تجہیز و تکفین اور تدفین مسنون طریق پر ہوئی اور اس طرح آپ اخیر تک صحیح لفظوں میں مسلمان رہے۔ کسی فرقہ سے منسلک نہ ہوتے۔

فیصلہ عدالت عالیہ ۱۹۷۱ء میں قائدِ اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کے بھانجے نے محترمہ فاطمہ جناح کی جائیداد کا نظم و نسق چلانے کے لئے عدالت عالیہ ہائیکورٹ کراچی میں درخواست گزاری۔ اس کی سماعت کے دوران عدالت عالیہ نے اٹارنی جنرل سید شریف الدین پیرزادہ۔ مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان۔ مولانا احتشام الحق تھانوی مولانا محمد حسین، ایم۔ این۔ کوتوال مرزا اختر حسین۔ ایم۔ آر۔ پیر بھائی اور محمد حنیف

وغیرہ کے بیانات قلمبند کئے۔

شریف الدین پیرزادہ نے اپنی شہادت میں کہا کہ قائداعظم نہ شیعہ نہ سنی تھے بلکہ وہ ایک مسلمان تھے۔ پیرزادہ نے عدالت کو بتایا کہ میرٹھ میں مسلم لیگ کے کارکنوں نے جب قائداعظم سے سوال کیا کہ وہ شیعہ ہیں یا سنی تو قائداعظم نے فوراً دریافت کیا کہ رسولِ اکرمؐ کیا تھے؟ اس موقع پر قائداعظم نے تفصیل سے کہا کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں شیعہ یا سنی نہیں ہیں۔ پیرزادہ نے مزید بتایا کہ لکھنؤ کے ظفرالملک کے نام ایک مکتوب میں قائداعظم نے لکھا تھا کہ ۲۱ر ماہِ رمضان المبارک کا دن منانا صرف شیعہ عقیدہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ حضرت علیؑ چوتھے خلیفہ تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمان شیعہ یا سنی ہونے سے قطع نظر یہ دن منایا کرتے تھے۔

پیرزادہ شریف الدین اس وقت پاکستان کے اٹارنی جنرل تھے، انہوں نے اپنی شہادت میں قائداعظم کے خطوط اور ساٹھ فائلوں کا حوالہ بھی دیا جو مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری شمس الحسن کے حوالے کی گئی تھیں۔ پاکستان بینکنگ کونسل کے سابق چیئرمین محمد جعفر پیربھائی نے عدالت کو بتایا کہ محترمہ فاطمہ جناح نے ایک گفتگو میں کہا تھا:-

"میں شیعہ نہیں ہوں۔ میں سنی نہیں ہوں میں مسلمان ہوں رسولِ اکرمؐ نے ہمیں اسلام دیا ہے جو فرقہ وارانہ مذہب نہیں ہے۔"

فاضل ججوں نے قرار دیا کہ عدالت اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتی کہ اسلام کے ابتدائی ڈیڑھ سو برس میں فرقوں کا کوئی وجود نہیں تھا اور چار مسلک حنفی مالکی۔ شافعی اور حنبلی دوسری صدی ہجری میں معرضِ وجود میں آئے اور سنی عقائد کے متعلق کتابیں چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں لکھی گئیں۔

سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس عبدالحق قریشی اور مسٹر جسٹس عبدالرزاق تھہیم پر مشتمل ایک ڈویژن بنچ نے قرار دیا کہ قائداعظم سچے مسلمان تھے۔ فرقہ واریت۔ احساسات۔ جذبات اور

عقیدہ سے ماورا تھے۔ ان کا آئیڈیل رسولِ اکرمؐ تھے اور قرآن پاک ہے جسے وہ مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے تھے۔ قائدِاعظم کے فرقہ وارانہ عقیدہ کا حوالہ مہمل اور غیر متعلقہ ہے کیونکہ جسٹس عبدالقادر شیخ پہلے ہی فیصلہ دے چکے ہیں کہ قائدِاعظم سچے مسلمان تھے۔ ان کا کوئی فرقہ وارانہ عقیدہ نہیں تھا۔ وہ قرآن اور رسولؐ کے پیروکار تھے۔ (روزنامہ جنگ ۸۰-۴-۱۲)
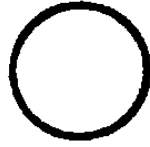
اتباعِ کتاب و سنّت

حسنِ کردار | قائدِ اعظم نے جب سے عملی زندگی میں قدم رکھا ہمیشہ کتاب و سنت کے احکام پر عمل پیرا رہے۔ جس کا ان کی مندرجہ ذیل عادات۔ معمولات۔ معاملت اور معاشرت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے :-

اسماعیلی پیشوا سر آغا خان قائدِ اعظم کے قریباً ہم عمر اور دوست تھے۔ اکثر ملنا جلنا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ سر آغا خان نے قائدِ اعظم کو نصیحت کی کہ ——

"کسی کو بھی کسی سے ملنے سے انکار نہ کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ اسے کتنا ہی ناپسند کرتا ہو یا اس کے خیالات سے کتنا ہی غیر متفق ہو۔

جناح! —— اگر خود شیطان بھی تم سے ملنا چاہے تو تمہیں اس کی ملاقات سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس کی بات سن لو یہ ضروری نہیں کہ تم اس کے خیالات سے اتفاق کرو یا اس کی نصیحت کو قبول کرو۔ تمہیں کیا معلوم کہ شاید وہ تمہیں کوئی ایسی بات بتا سکے جو تمہارے فائدہ کی ہو یا بہت عمدہ ہدایت و نصیحت ثابت ہو۔"

قائدِ اعظم نے اسے اپنی زندگی کا سنہری اصول بنا لیا۔ جب بھی آپ کو ملنے کے لئے کوئی آتا۔ تو بشرطِ فرصت اسی وقت یا پھر بہ تعینِ وقت اس سے ضرور ملتے خواہ وہ واقف ہو یا ناواقف۔ آپ کی اسی عادت کا ایک خاکسار نے فائدہ اٹھایا اور آپ سے ملنے کے بہانے آپ تک پہنچا اور آپ کو اکیلا دیکھ کر آپ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ آپ بچ گئے۔ مگر آپ چونکہ ہر معاملہ میں خدا پر بھروسہ کرنے کے عادی تھے۔ اس لئے اس واقعہ کے زیرِ اثر آپ نے کبھی ملنے والوں پر کوئی پابندی نہ لگائی۔ چونکہ آپ خود کو ملک و ملت کا

خادم تصور کرتے تھے۔ اس لئے جو بھی ملنے آتا آپ بخوشی ملتے۔

صفاتِ حمیدہ قائدِ اعظم بے پناہ قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ جب ایک دفعہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو پھر کوئی ترہیب یا ترغیب آپ کے فیصلہ کو نہ بدل سکتی۔ آپ کو ایسا دل و دماغ عطا ہوا تھا کہ چشم زدن میں معاملہ کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ قانونی اور سیاسی معاملات میں آپ کی فہم رسا کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے آپ کوئی فیصلہ ایسا نہ کرتے۔ جس پر گاندھی جی کی طرح بعد میں آپ کو پچھتانا پڑتا یا اسے بدلنا پڑتا یا اس سے منحرف ہونا پڑتا۔

سیاسی یا سرکاری مصروفیات کے علاوہ قرآن کریم، احادیثِ نبوی اور اسلامی سیاسی لٹریچر کا مطالعہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا۔ دنیا کے گوشہ گوشہ سے آتے ہوئے خطوط وغیرہ آپ خود لکھوتے، خود جواب دیتے تھے۔ شب و روز کام، مسلسل کام اور تھکا دینے والا کام کرتے رہتے مگر تفریح طبع کا کوئی اہتمام نہ کرتے۔ تنہائی ہے۔ مقدمات کی مسلیں یا سیاسی کاغذات سے یارانہ ہے کوئی مخلص مصاحب نہیں۔ کوئی محرم راز نہیں، کسی کو مزاج میں دخل نہیں نہ کوئی رفیق ہے نہ صلاح کار ہے جو کچھ بیت رہی ہے۔ تنِ واحد پر سہار رہے ہیں۔ اپنی الگ دنیا بسا رہے ہیں اور خلوت میں بیٹھے تدبر کے تیر چلا رہے ہیں۔

سفر میں اپنا سامان خود باندھتے۔ اپنی قمیض کے بٹن تک خود ٹانکتے۔ دن اور رات میں تقریباً بارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے۔ حتیٰ کہ عید کے روز بھی آپ ناغہ نہ کرتے۔ کیونکہ اسلام میں کوئی چھٹی نہیں۔

حق گوئی میں کبھی کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ جس بات کو حق سمجھتے۔ اُسے ببانگ دہل منہ پر کہہ دیتے یا خط میں لکھ دیتے۔

سلہٹ کی رائے شماری کے موقعہ پر لارڈ مونٹ بیٹن نے دانستہ یا نادانستہ فوجی نگرانی کا بندوبست نہ کیا۔ جس پر قائدِ اعظم نے لارڈ مونٹ بیٹن کو ۲۸ جون ۱۹۴۷ء کو جو بیباکانہ خط لکھا۔ اُسے لارڈ موصوف کا چیف آف سٹاف لارڈ اسمے پڑھکر تلملا اٹھا اور کہا ــــ

"اگر بادشاہ معظم بھی مجھے ایسا خط بھیجتے تو میں قبول نہ کرتا اور نہ ہی ایسا خط میں اپنے خادم کو لکھ سکتا ہوں" (عہد مونٹ بیٹن صـ۱۷۰)

محنتِ شاقہ محنت کے بغیر دنیا میں کوئی پھل نہیں ملتا اور محنت کی عادت قائدِ اعظم کو بچپن سے پڑی اور تادمِ آخر قائم رہی۔ اسی نے آپ کو تاریخ کا ممتاز ترین سیاستدان بنا دیا۔ وائسرائے ہند کا مشیر مسٹر ہڈسن لکھتا ہے کہ ـــــــ

"جناح ایک انتھک کارکن تھا۔ وہ مسلسل کئی کئی دن، شب و روز تنہائی میں اپنے مقدمات یا سیاسی کاغذات کے مطالعہ میں منہمک رہتا۔ سنگین مسائل پر غور و فکر میں اس کا کوئی محرم راز تھا۔ اس کے مزاج میں کسی مصاحب کا دخیل ہونا تو کجا۔ اس کے قریب ترین ساتھی کو بھی اس کے کسی فیصلہ کا کبھی قبل از وقت پتہ نہ چل سکا۔ اس کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے نہ کوئی ہم پایہ رفیق نہ ہم مرتبہ صلاح کار میسر تھا۔ اس لئے اس کی دنیا سب سے الگ تھی۔ وہ دس سال تک فرہاد کی طرح تنہا اپنے تیشۂ فکر سے سیاست کی سنگلاخ چٹانوں کو چیرتا رہا۔

اس کے اعصاب کی چوکسی کا کیا کہنا۔ اتنے طویل عرصے تک تفریح یا آرام کا وقفہ نصیب نہ ہونے اور اتنی ذہنی ریاضت کے باوجود کیا مجال کہ کسی دوستانہ ماحول کسی نجی گفتگو یا خاندانی تقریب میں سہواً کوئی راز کی بات اس کے منہ سے نکل گئی ہو۔" (قائدِ اعظم محمد علی جناح از چوہدری رحمت علی علوی صـ۱۳۱)

آپ کی محنت کی عادت کی بہترین شاہد محترمہ فاطمہ جناح کا بیان ہے کہ ـــــــ

"میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ مصروف انسان نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ سے دماغی مشقت کے عادی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد تو ان میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا ہو گیا تھا۔ جب تک ان کے ہاتھ شل نہ ہو جاتے وہ لکھتے رہتے۔ جب تک دماغ معطل نہ ہو جاتا دماغی کام جاری رکھتے اور جب

تک آنکھیں تھک نہ جاتیں۔ مطالعہ میں مصروف رہتے۔ میں ہمیشہ اصرار کرتی کہ دم لے لیجئے۔ مگر وہ شفقت سے مسکرا کر کہتے " فاطمہ میں بہت مصروف ہوں"۔

پاکستان اسی انتھک محنت کا ثمرہ ہے جو قدرت نے دنیا کے اس عظیم انسان کو عطا کیا۔

احساسِ ذمہ داری | قائدِاعظم کا معمول تھا کہ روزانہ جو امدادی رقوم یا چندہ وغیرہ باہر سے آتا تو ہر رسید پر آپ بذاتِ خود دستخط کرتے تھے خواہ وہ چار آنے کی ہوتی یا چار ہزار کی۔ جب آپ سے کہا جاتا کہ یہ کام دوسرے سے بھی لیا جا سکتا ہے تو فرماتے،

" ہرگز نہیں ان رسیدوں پر مجھے دستخط کرنے چاہئیں۔ اس غریب شخص کے لئے جو مجھے چار آنے بھیجتا ہے۔ یہ رقم ایسی ہی ہوگی جیسے کسی متمول شخص کے لئے دس ہزار۔ میری نظر میں اس کے چار آنے کے عطیہ کی بھی اتنی ہی قیمت ہے جتنی کہ دس ہزار بلکہ بیس ہزار کے عطیہ کی۔ اس غریب کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور اس کے عطیہ کو قیمتی سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں جب میں کسی رسید پر دستخط کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے پیشِ نظر مقصد کے لئے ہمیں ایک اور خیر خواہ مل گیا ہے۔ اس مسرت سے بڑھ کر مجھے اپنی قوم سے اور کون سا انعام مل سکتا ہے۔ بہر صورت چند سو رسیدوں پر دستخط کرنے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ عوام کی امداد و تائید سے لیگ کی اور میری قوت میں اضافہ ہوگا اور اپنی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے لئے ہمیں اسی قوت کی ضرورت ہے"۔ (قائدِاعظم میری نظر میں ص۲۹ جریدی)

جو لوگ بڑے بڑے عطیات کا جلسوں میں اعلان کرتے اور پھر نہ بھیجتے۔ ان کو بھی یاد دہانی کے خطوط آپ خود لکھتے، ان خطوط میں سب سے اہم یہ فقرے ہوتے ———

" آپ نے جس عطیہ کا اعلان کیا تھا۔ وہ جلد از جلد بھیج دیں۔ اب خاصا وقت گزر چکا ہے۔ اس کے بارے میں یاد دہانی کراتا ہوں۔ کیونکہ جن عطیات کا

مجمع عام میں اعلان کیا جاتا ہے۔ ان کے وصول کرنے کی ذمہ داری میرے ہی سر پر ہے۔ بصورت دیگر مجھے یہ اعلان کرنا پڑے گا کہ انہوں نے اپنے وعدے پورے نہیں کئے۔" (ایضاً)

نظم و ضبط قائداعظم بہت بڑے جمہوریت پسند تھے۔ آمروں کی طرح آپ نے کبھی بھی اپنی جماعت پر اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش نہ کی۔ جب کسی ملکی یا ملّی مسئلہ پر آپ کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تو آپ نے فوراً فرمایا کہ ——

"مسلم لیگ کا صدر ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میں جماعت کے فیصلہ سے پہلے ہی اپنی رائے کا اظہار کردوں"!

عام لیڈروں کی طرح آپ کو بیان بازی کا شوق نہ تھا۔ نمائندہ ہونے کی حیثیت سے بھی آپ اس وقت تک کبھی کسی رائے کا اظہار نہ فرماتے۔ جب تک کہ اس کے متعلق مشورہ نہ کر لیتے ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں کسی کانفرنس میں اس وقت تک شرکت نہ فرماتے جب تک کہ مسلم لیگ کا اجلاس بلاکر اس کی رضامندی اور مسلمانوں کا اعتماد حاصل نہ کر لیتے۔

قومی کاموں نے آپ کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ آپ کسی کے ساتھ نہ دوستی کی پینگیں بڑھا سکے، نہ کسی سے دل کھول کر بات کر سکے۔ نہ جی بھر کر ہنس سکے۔ ان باتوں کے لئے آپ کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ آپ اپنی زندگی اور اپنی صلاحیتوں کو قوم کی امانت سمجھتے تھے اور اسے اشد ضرورت کے بغیر خرچ کرنا خیانت تصور کرتے تھے۔ اس لئے بہت کم لوگوں کو آپ سے شرفِ باریابی یا قرب کا موقع ملا۔ اور انہی سے کبھی کبھار ہنسی مذاق ہوگیا تو ہوگیا۔ ورنہ اس کی کبھی آپ نے کوشش نہ کی نہ ضرورت سمجھی۔ کم گوئی کو ہی ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھا۔

حق تعالیٰ نے آپکو عظمت کے ساتھ ہیبت بھی عطا کی تھی۔ اسی لئے نئے سرکاری ملازمین کو آپ کے قریب جانے یا گھل مل کر بات کرنے کی جرآت ہی نہ ہوتی تھی کہ کہیں قواعدِ ضوابط کی گرفت میں نہ آجائیں۔

قائداعظم، نظم و ضبط کے لئے گرفت کرنے میں اپنے مقربین اور معتمدین کو بھی نہیں

بخشتے تھے۔ گورنر جنرل بننے کے بعد آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس دسمبر ۱۹۴۷ء میں طلب کیا۔ خالق دینا ہال کے صدر دروازہ پر انتظامات کی نگرانی کے لئے آپ کے منظورِ نظر نواب صدیق علی خان بطور سالارِ اعلیٰ نیشنل گارڈ اپنی وردی میں ملبوس آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے اور ہر ایک کا پاس داخلہ چیک کر رہے تھے۔ لیکن جب جانے پہچانے قائدِ اعظم بحیثیت گورنر جنرل اپنے ہر دو اے۔ ڈی۔ سی صاحبان کی معیت میں داخلہ کا پاس جیب میں ڈالے جلوہ افروز ہوئے تو نواب صاحب نے آپ کا پاس داخلہ چیک کرنا سوئے ادب سمجھا۔ آپ ہال کے اندر داخل ہوئے اور تھوڑا فاصلہ طے کر کے ٹھٹک سے رک گئے اور نواب صاحب کو سر اور آنکھوں کے اشارہ سے قریب طلب کر کے چپکے سے دریافت فرمایا کہ ــــ

"آپ نے ٹکٹ کیوں نہیں مانگا؟"

نواب صاحب نے اعترافِ خطا کیا۔ احساسِ فرض یاد دلانے کے بعد آپ پر عفو و کرم کی ہلکی سی مسکراہٹ بجلی کی طرح کوندی اور آپ آگے نکل گئے۔

غرض کہ نظم و ضبط آپ پر ختم تھا۔ آپ کے نزدیک نظم و ضبط کے بغیر کسی معاشرہ کا ترقی و خوشحالی کی منزل پر پہنچنا تو درکنار زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ــــ

"اگر تم اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں نظم و ضبط کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اگر تمہیں پارٹی ایک لیمپ کے کھمبے کو ووٹ دینے کے لئے کہے تو آپ اسی کو ووٹ دیں۔"

اصولوں کی پابندی تادیبی کارروائیوں کے بغیر نظم و ضبط بحال نہیں رہ سکتا۔ قائدِ اعظم چونکہ ہر معاملہ میں اصول کی پابندی کرتے تھے اور اپنی ذات تک کو پابندیوں سے مستثنیٰ نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے آپ کی تادیبی کارروائیاں بڑی مؤثر ثابت ہوتی تھیں۔ اس معاملہ میں قائدِ اعظم بڑے سے بڑے لیڈر کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ

کا وقار قائم رکھنے کے لئے مختلف اوقات میں مسلم لیگ کی حکم عدولی کی پاداش میں مندرجہ ذیل نامور زعماء کو اس طرح مسلم لیگ سے خارج کر دیا۔ جس طرح آٹے میں سے بال نکالا جاتا ہے۔

۱۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ ۲۔ مولوی فضل حق

۳۔ نواب سر احمد سعید خان آف چھتاری ۴۔ سر سلطان احمد ۵۔ مسٹر سید

سر سکندر حیات خان اور سر سعد اللہ نے چونکہ اپنی غلطی تسلیم کر کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس لئے وہ تادیبی کارروائی سے بچ گئے۔

قائداعظم مسلم لیگ کو بازیچۂ اطفال اور موم کی ناک نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ سب وزراء کو مسلم لیگ کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے اور اگر وہ خودسرائی کرتے تو فوراً گردن سے پکڑ لئے جاتے۔ مثلاً ——

۱۹۴۴ء میں سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیراعظم سندھ نے مسلم لیگ کا مشورہ لئے بغیر ایک انگریز مسٹر تھامس کو وزیر زراعت بنالیا۔ جب یہ خبر قائداعظم کے کانوں تک پہنچی تو آپ نے فوراً غلام حسین کو دہلی بلایا اور ان سے کہا کہ آپ خود مختار وزیراعظم نہیں بلکہ لیگ کے نمائندہ ہیں اور لیگ کے مشورہ کے بغیر خودمختارانہ قدم نہیں اٹھا سکتے، اس لئے یا خود وزارت عظمیٰ سے دست بردار ہو جائیں یا اس انگریز وزیر زراعت کو برطرف کر دیں۔ جس پر انہوں نے انگریز وزیر سے استعفیٰ داخل کرا کر اپنی وزارت بچائی۔ مگر اس سے انہوں نے کوئی سبق حاصل نہ کیا اور اسی بے ضابطگی کا پھر اعادہ کرتے ہوئے۔ اپنے مخالف مسٹر سید کو زک پہنچانے کے لئے سابق وزیراعظم سندھ اللہ بخش مرحوم کے بھائی مولا بخش کو وزارت میں لے لیا۔ قائداعظم نے ان کی اس خودسری کو برداشت نہ کیا اور غلام حسین کو فوراً حکم دیا کہ:

”مولا بخش کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر لے آئیں۔ کیونکہ غیر مسلم لیگی لیگ وزارت میں وزیر نہیں بن سکتا یا خود وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو جائیں“

جس پر غلام حسین نے وزارت توڑ دی اور از سر نو وزارت بنائی اور اس میں مولا بخش کو نظر انداز کر دیا گیا۔

پابندیٔ وقت

دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز وقت ہے جو ضائع ہو جائے تو پھر کسی قیمت پر ہاتھ نہیں آتا۔ وقت آپ کی بہت بڑی دولت تھی۔ آپ اس کا ایک منٹ بھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ جب بھی دیکھو کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتے تھے۔ ملنے ملانے کے دوران بھی آپ اپنے وقت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ گفتگو نہایت مختصر مگر واضح کرتے تھے اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کراتے تھے۔ بے سود بات چیت کے لئے آپ کے پاس کوئی وقت نہ ہوتا تھا۔

اوائل اپریل ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور بنگال کے سیاسی رہنما خواجہ ناظم الدین دہلی میں دورۂ قلب کی وجہ سے سخت بیمار پڑ گئے اور انہیں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ بعد ازاں مجلس عاملہ کے چند ارکان راجہ محمود آباد اور حسن اصفہانی وغیرہ نے اپنے بیمار دوست کی طبع پرسی کے لئے ہسپتال جانے کا پروگرام بنایا اور قائدِ اعظم سے بھی پوچھا کہ آیا وہ ناظم الدین کو دیکھنا پسند کریں گے تو آپ نے فرمایا ـــــــ

"اگر میں نے ایک دفعہ بیمار اور علیل لوگوں کی عیادت کرنا شروع کر دی تو اپنا زیادہ تر وقت اسی فریضہ کی ادائیگی میں صرف کرنا پڑے گا اور میرے دوسرے اہم کاموں کے لئے وقت نہیں بچے گا۔ جس پر برِعظیم کے مسلمانوں کے مستقبل کا دارو مدار ہے۔"

یہ فرما کر آپ پھر میز پر جھکے ہوئے کاغذات کے ڈھیر کی طرف متوجہ ہو گئے اور آپ کے مذکور الصدر دوست تصویرِ حیرت بنے کمرہ سے باہر نکل آئے۔

قائدِ اعظم وقت کا ضیاع کسی قیمت پر برداشت نہ کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد سٹیٹ بینک کی افتتاحی تقریب میں آپ بحیثیت مہمانِ خصوصی ٹھیک وقت مقررہ پر تشریف لائے۔ لیکن وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں و دیگر وزراء اور اعلیٰ سرکاری حکام بروقت نہ پہنچے تھے۔ جس کی وجہ سے اگلی رو کی کئی ریزرو کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آپ نے کارروائی شروع کرنے کے حکم کے ساتھ

ہی فرمایا کہ ــــــ

"تقریب گاہ میں موجود تمام خالی کرسیاں اٹھالی جائیں۔ تاکہ جو حضرات بعد میں آئیں انہیں کھڑا رہنا پڑے اور آئندہ انہیں پابندیٔ وقت کا خیال رہے۔"

چنانچہ فوراً حکم کی تعمیل کی گئی۔ تقریب کے شروع ہونے کچھ دیر بعد جب لیاقت علی خاں اور دوسرے وزراء آئے تو سب بحالتِ شرمندگی و خجالت کھڑے رہے اور کسی کو کرسی پیش کرنے یا ان کے لئے کرسی لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب قائدِاعظم تقریب کے بعد روانہ ہونے لگے تو سب نے دیر سے آنے کی بڑی معذرت کی اور اس کے بعد کسی مقتدر سے مقتدر ہستی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ دیر سے تقریب میں پہنچے۔

سیاست کا کھیل بھی آپ اسی انداز سے کھیلتے اور بالآخر کامیاب رہتے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

صاف بیانی آسٹریلیا کے ایک سابق وزیر خارجہ مسٹر آر۔ جی کیسی ۴۵-۱۹۴۴ء میں متحدہ صوبہ بنگال کے گورنر رہے۔ انہوں نے اپنے عہدِ گورنری کے واقعات و حالات پر مشتمل ایک کتاب بعنوان (TWO YEARS IN INDIA) (ہندوستان میں دو سال) لکھی۔ اس میں انہوں نے قائدِاعظم کے حالات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ــــــ

"قائدِاعظم اختیار اور ذمہ داری کے تقاضوں کو نبھانا بھی خوب جانتے ہیں۔ وہ صاف اور سیدھی[1] بات کرتے ہیں اور جب کوئی بات کہتے ہیں تو اس کے مفہوم کے بارے میں کسی کو مغالطہ باقی نہیں رہتا۔"

ایک مرتبہ قائدِاعظم نوابزادہ لیاقت علی خان اور اپنے سیکرٹری کو ایک بیان لکھوا رہے تھے۔ لیاقت علی خان اور سیکرٹری بیان کو خوبصورت بنانے کے لئے الفاظ

---

[1] یہی قرآن کریم کا تقاضا ہے کہ قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا (الاحزاب ۹/۲۲) بات سیدھی کہو۔

کے چکر میں پھنسے ہوتے تھے۔ آپ نے تنگ آکر کہا کہ ـــــ

"مجھے الفاظ کی شوکت نہیں چاہئے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ بیان کروں دوسرا اسے سمجھ سکے اور بس!"

سفارش سے گریز قائداعظم سفارش کرنے کے عادی نہ تھے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم تلاشِ روزگار کے دوران قائدِاعظم کے پاس جا پہنچا اور کہا کہ اگر آپ فلاں صاحب سے میری سفارش کر دیں تو مجھے ملازمت مل سکتی ہے۔ قائدِاعظم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں سفارش نہیں کیا کرتا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر طالب علم سے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے ـــــ

آپ نے پوچھا "کیا دورانِ تعلیم کھیلوں میں بھی کبھی حصہ لیا تھا؟"

طالب علم نے جواب دیا نہیں!

آپ نے دوسرا سوال کیا کہ "کالج یا یونیورسٹی کی ادبی مصروفیات میں تمہارا کتنا حصہ ہوتا ہے۔

طالب علم نے کہا کہ میں ادبی مصروفیات سے بھی لاتعلق رہا۔

آپ کا تیسرا سوال تھا کہ یونیورسٹی یا کالج میں کوئی بھی مشغولیت ایسی تھی جس میں تم نے حصہ لیا ہو؟

طالب علم نے اس کا بھی جواب نفی میں دیتے ہوئے گردن ہلا دی کہ ـــــ

"میں بدورانِ تعلیم لکھنے پڑھنے کے سوا ہر چیز سے لاتعلق رہا"

قائدِاعظم نے فرمایا ـــــ

"آپ چلے جائیں۔ میں آپ جیسے فضول اور نکمے آدمی کی سفارش نہیں کر سکتا"

نوجوان طالب علم نے افسردگی کے عالم میں پیچھے ہٹتے ہوئے آپ کو الوداعی سلام کہا اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ ـــــ

"آپ سفارش کریں یا نہ کریں مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن میں جھوٹ ہرگز نہ

بولوں گا"۔

قائدِ اعظم تیزی سے اس کی طرف لپکے لیکن وہ کمرہ سے نکل چکا تھا۔ آپ نے اپنے سیکرٹری سے کہا اسے روکو اور دوبارہ میرے پاس لاؤ۔ سیکرٹری نے دوڑ کر اسے روکا اور واپس لاکر قائدِ اعظم کے سامنے پیش کر دیا۔ اسے دیکھ کر قائدِ اعظم کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس طالب علم سے فرمایا کہ ——

"میں اپنے اصول کے خلاف زندگی میں پہلی بار آپ کی سفارش کر دوں گا۔ میں سفارش نہیں کیا کرتا۔ یہ میری زندگی کا قیمتی اصول ہے۔ لیکن تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ بھی کبھی تم جھوٹ نہیں بولو گے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح تم نے ابھی کہا تھا"۔

چنانچہ قائدِ اعظم کی سفارش پر اس کی مشکل آسان ہو گئی اور آپ نے زندگی میں غالباً پہلی بار سچ کی خاطر اپنا ایک اصول توڑا۔

بے دھڑک نکتہ چینی

ایک مرتبہ آپ کے ایک دوست نے خط لکھا کہ ان کے لئے حیدر آباد کے ریذیڈنٹ جنرل سے سفارش کی جائے کہ وہ ان کو دوبارہ ملازمت پر بحال کر دے۔ اس کے جواب میں قائدِ اعظم نے انہیں لکھا کہ ——

"انگریز حکام سے سفارش کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا اور نہ آج کروں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ان پر کیسی بے دھڑک نکتہ چینی کرتا ہوں۔ اگر کسی دوست کے لئے کسی انگریز عہدہ دار سے سفارش نہ سہی۔ فرمائش ہی کر دوں تو وہ بڑی خوشی سے فرمائش پوری کر دے گا۔ مگر اگلے دن جب میں اس کے کام یا محکمے پر تنقید یا تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہونگا اور دور سے مجھے دیکھ کر مسکرائے گا تو کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ میں ویسی ہی بے لاگ تنقید کر سکوں گا"؟

دیسی علاج کو ترجیح

قائدِ اعظم طبِ اسلامی کے حامی تھے اور طبی ادویات کو ایلوپیتھی نسخوں پر ترجیح دیتے تھے۔ کباب کھانے کے بہت شوقین تھے۔ اس لئے آپ کے ڈنر میں کباب کی پلیٹ لازمی رکھی جاتی تھی۔ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کے سیکرٹری خواجہ اسداللہ کا بیان ہے کہ ——

"قائدِ اعظم ممدوٹ ولا میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈنر پر کباب اور ان کے پسندیدہ کھانے پیش کئے گئے۔ ڈنر کے تھوڑی دیر بعد قائدِ اعظم نے پیٹ میں تکلیف کی شکایت کی۔ میں نے مولی کا نمک پیش کیا۔ جسے استعمال کرنے کے بعد ان کو آرام آگیا۔ پوچھا یہ دوائی کہاں سے ملے گی۔ مجھے منگوا دیجئے۔ میں نے اسی وقت ایک درجن شیشیاں نمک مولی منگا کر پیش کر دیں"۔

غالباً دہلی میں ایک کانفرنس کے موقع پر قائدِ اعظم نے فرمایا تھا کہ ——

"بچپن میں جب کبھی زکام ہوتا تھا تو دادی مرحومہ جوشاندہ پلایا کرتی تھیں۔ اب بھی میں زکام کی حالت میں جوشاندہ استعمال کرتا ہوں"۔

آمریت سے احتراز

قائدِ اعظم جمہوریت کے علمبردار تھے۔ پورے ایشیا میں جتنی عزت وعظمت اور محبوبیت ومقبولیت آپ کو حاصل رہی۔ وہ کسی اور کو اتنی نصیب نہ ہوئی۔ اتنے عزو وقار کے باوجود آپ کے دل میں کبھی خودنمائی کا خیال پیدا نہ ہوا۔ اربابِ مسلم لیگ کے کلی اعتماد کے باوجود آپ نے کبھی آجکل کے آمروں کی طرح من مانی کی یا دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلائی۔ نہ ہی آپ نے کبھی اربابِ مسلم لیگ میں سے کسی کو اپنے طور پر دوسروں پر ترجیح دی نہ کبھی کوئی بے قاعدگی اور بے ضابطگی کی۔

آپ ایک عملی انسان تھے۔ اس لئے زبانی جمع خرچ کے عادی نہ تھے جو کہتے تھے وہ کرتے بھی تھے۔ گاندھی کی طرح مکر نہ جاتے تھے۔ آپ نے کبھی دانستہ یا نادانستہ اپنی رائے دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ ہر ایک کو اپنے دائرہ کار میں کام کرنے کی پوری

آزادی دی۔ اگر کوئی پاکستان کے تنظیمی ڈھانچے یا آئین کے متعلق سوال کرتا تو آپ ایسے ہر سوال کا مختصراً یہی جواب دیتے کہ ——

"اس کے فیصلے کا اختیار دستور ساز اسمبلی کو ہے"۔

اگر وائسرائے یا کوئی وزیر آپ سے یقین دہانی چاہتے تو اسے یہی جواب دیتے کہ ——

"میں اپنی مجلس عاملہ سے مشورہ کر کے بتاؤں گا"۔

اپنی ذاتی سرداری پر کبھی کوئی اقرار یا انکار نہ کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد وزارتیں بننے لگیں تو اس سلسلہ میں مسلم لیگی ارکان میں خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس امر کا احتمال پیدا ہو گیا کہ ممکن ہے کوئی امیدوار کسی بااثر لیڈر کی وساطت سے کامیابی کی کوشش کرے —— اس لئے آپ نے اس احتمال کے ازالہ کے لئے ۲۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو ایک بیان جاری کر کے اس معاملہ میں اپنی پالیسی کا یوں اعلان فرمایا کہ ——

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہے کہ میں براہِ راست یا بالواسطہ پنجاب یا بنگال میں کسی لیڈر کو پسند یا ناپسند کرتا ہوں۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے کسی رکن کو کسی دوسرے رکن پر ترجیح نہیں دیتا۔ ہاں میری یہ خواہش ضرور ہے کہ ایک آدمی کو جب چن لیا جائے تو ہارا ہوا فریق جیتنے والے سے پُرخاش نہ رکھے اور فراخدلی سے تعاون کرتا رہے"۔

افسوس! —— کہ آپ کے بعد یہ صورتِ حال کہیں پاکستان کے اندر دیکھنے میں نہ آئی۔

ترکیبِ جنگ

وائسرائے کے مشیر مسٹر ہڈسن لکھتے ہیں:-

"جناح ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر آگے اور پیچھے دونوں طرف سے دشمن پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ سامنے سے حملہ کر کے دشمن کو پیچھے ہٹانا اور عقب سے چھاپہ مار کر اس کی رسد منقطع کرنا اس بوڑھے جرنیل کی ترکیبِ جنگ کے دو اہم محاذ تھے۔ اس کی حکمتِ عملی کا محور یہی تھا کہ اپنے مقصد پہ ڈٹے رہو۔ دشمن پہ دباؤ کم نہ ہونے دو۔ جب تک

اشتعال یا اکتاہٹ میں فریق ثانی کے مزید پیچھے ہٹنے، کوئی رعایت دینے یا کوئی غلط قدم اٹھانے کا امکان ہو۔ گفت و شنید جاری رکھو۔ لیکن جب پیش قدمی رک جائے تو جو کچھ مل رہا ہو۔ اسے کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو۔ تاکہ دشمن اس کا فائدہ نہ اٹھا سکے"۔

(مشیر وائسرائے مسٹر ہوڈسن)

دُعائے ہدایت

الحاج واحد حسین خان علیگ اپنے مکتوب مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں مزید لکھتے ہیں کہ:- "جناح کے جلسوں کو ناکام بنانے والے ہمارے علی گڑھ کے ساتھی مقرب اور اویس وغیرہ کمیونسٹ تھے۔ جنہیں کانگرس نے جناح کے جلسوں کو ناکام بنانے کے لئے بھیجا تھا۔ مگر ہم نے انہیں بتا دیا تھا کہ اگر کسی جلسہ میں گڑبڑ کرو گے تو مار کھاؤ گے۔ لہٰذا وہ کچھ نہ کر سکے۔ ورنہ وہ پبلک کی طرف سے اُلٹے سوالات کر کے جلسہ ناکام بنانے آتے تھے۔

جب مسٹر جناح واپس کلکتہ جانے کے واسطے میرے اور جمال میاں کے درمیان میل ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور دوسری جانب مقرب اور اویس وغیرہ ٹہل رہے تھے تو میں نے مسٹر جناح سے کہا کہ یہ بھی ہمارے ساتھ علی گڑھ میں تھے۔ خدا ان کو غارت کرے۔ جس پر مسٹر جناح نے مجھے ٹوکا کہ یہ نہ کہو۔ یہ کہو کہ "خدا ان کو ہدایت دے"۔

قائدِ اعظم کا ہمیشہ اس ارشادِ نبویؐ پر عمل رہا کہ :-

"خطا کا بدلہ عطا"

سے دیا جائے۔

مثالی اسلامی کردار

پیکرِ انسانیت قائدِ اعظم کی خانگی۔ مجلسی۔ خلوتی زندگی کو تعصب۔ خود غرضی اور جانبداری کی عینک اتار کر جھانکیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس مردِ مومن نے کتاب و سنت کے زریں اصولوں کو اپنے لئے فرضِ عین سمجھ رکھا تھا۔ اسلام ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور انہوں نے اسلام کے ہر تقاضے کی پابندی اپنے اوپر لازم کر رکھی تھی۔ اسی لئے انہیں غیر مسلم بھی انسانِ کامل سمجھتے تھے۔ کیونکہ قائدِ اعظم تمام بشری خصوصیات کے حامل اور مظہر تھے اسی لئے ——

- انگریز صحافی اور مصنف بیورلی نکلسن نے قائدِ اعظم کو مافوق البشر قرار دیا۔
- بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو نے لکھا کہ قائدِ اعظم انسانِ کامل کے درجہ پر فائز ہیں۔ ان کا دل انسانیت کے جذبہ سے پُر ہے۔ کوئی عورت بھی ان کی طرح نرم دل نہ ہو گی"۔

امور بالا کے مندرجہ ذیل حقائق شاہدِ عدل ہیں جو اجتماعی طور پر کسی دوسرے سیاسی لیڈر میں آج تک دیکھنے میں نہ آئے ۔

حسنِ سیرت قائدِ اعظم بفضلہٖ تعالیٰ شروع سے نہایت پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کو کسی قسم کی کوئی بُری عادت نہ تھی۔ غربت پر امارت کے قبضہ کے بعد اگر آپ چاہتے تو کسی کو بھی رفیقہ حیات بنا سکتے تھے مگر سیاسی شغف، قوم کی پسماندگی کا احساس اور ترقی کی فکر میں اس کا خیال تک نہ آیا۔ پہلی بیوی کی وفات کو ربع صدی یعنی پورے

پچیس ۲۵ سال گزر گئے، مگر آپ نے دوسری شادی کی ضرورت محسوس نہ کی اور اپنی عمر عزیز کے چالیس برس اپنی وجاہت اور خوش ذوقی کے باوجود بے عیب گزار دیئے حالانکہ آپ عورتوں میں بہت مقبول تھے۔ وہ آپ کی دلکش صحبت سے بہت محظوظ ہوتی تھیں مگر آپ کے پاس ان سے بے سود گفتگو کرنے کے لئے وقت نہ ہوتا تھا۔

کفایت شعاری اسلام نے فضول خرچی یا بے جا مصرف پر اس حد تک قدغن لگا رکھی ہے کہ دریا کے کنارے پر بیٹھ کر وضو کرتے وقت بھی زائد از ضرورت پانی استعمال نہ کیا جائے۔ قائدِ اعظم اس اصول کے بھی اتنے پابند تھے کہ اگر کوٹھی میں بلا ضرورت بتیاں جل رہی ہوتیں تو آپ انہیں بجھوا دیتے اور بسا اوقات خود اٹھ کر بجھا دیتے۔ اگر کسی کے ہاں مہمان ہوتے اور آپ کی خاطر زائد از ضرورت بتیاں جل رہی ہوتیں تو ان کی روشنی گل کرا دیتے۔ یہی حال پریذیڈنٹس ہاؤس میں رہا۔ جہاں آپ بحیثیت گورنر جنرل رہائش پذیر تھے۔ سرکاری مال کو اکثر سرکاری افسر اور ملازم جس بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور اس سے ذاتی مفاد اٹھاتے ہیں۔ وہ سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ مگر وہاں بھی آپ کی یہ حالت تھی کہ اگر کسی وقت بلا ضرورت یا زائد از ضرورت بتیاں جل رہی ہوتیں تو آپ فوراً ان کو بجھوا دیتے اور فرماتے کہ ——

"روپیہ ضائع کرنا ایک گناہ ہے اور اگر وہ عوام کا روپیہ ہو تو اور بھی بڑا گناہ ہے۔"

قائدِ اعظم فضول خرچی کے سخت مخالف تھے۔ آپ فضول خرچیوں کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ جب مناسب موقع دیکھتے۔ بلا تامل یا تردد اس بات کا اظہار فرما دیتے کہ ——

"بلا ضرورت کوئی چیز نہ خریدو اور بلا قیمت کوئی چیز بھی قبول نہ کرو۔"

چنانچہ آپ خود بھی بلا قیمت کوئی چیز قبول نہ فرماتے تھے۔

غیرت و خودداری کفایت شعاری چونکہ آپ کی عادت میں داخل تھی اس

لئے فضول خرچی کا آپ کے ہاں تصور ہی نہ تھا۔ گورنر جنرل کے عہدہ لینے کے بعد جب آپ مشرقی پاکستان کے دورہ پر تشریف لے جانے لگے تو آپ کے پاس وہی ایک پرانا دقیانوسی ڈکوٹہ جہاز تھا جو تقسیم ہند کے وقت گورنر جنرل کے حصّہ میں آیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے سفر کے لئے اسے راستہ میں تیل لینے کے لئے دہلی میں پالم پور کے ہوائی اڈہ پر لازماً اترنا تھا۔ مگر قائدِاعظم نے سرزمینِ ہند پر قدم رکھنے گوارا نہ کئے۔ اور فرمایا ایسا انتظام ہو کہ جہاز اترے بغیر سیدھا چلا جائے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ کے۔ ایم۔ ایل کے مخصوص طیارہ سے سفر کیا جائے تو قائدِاعظم نے فرمایا کہ پہلے اس کا کرایہ معلوم کیا جائے۔ پتہ چلا کہ آمدورفت پر تقریباً سات لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ سرکاری خزانہ اس وقت خالی تھا۔ کسی سے اس ضرورت کے لئے روپیہ مانگنا قائدِاعظم کی غیرت خودداری نے گوارا ہی نہ کیا۔ نہ ہی آپ اپنے آرام و آسائش پر ٹیکس دہندگان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کا ایک پیسہ خرچ کرنے کے عادی تھے۔

آخر سوچ بچار کے بعد قائدِاعظم نے یہ تجویز نکال لی کہ ڈکوٹہ جہاز میں پٹرول کی ایک مزید ٹینکی لگا دی جائے تاکہ اسے راستہ میں تیل لینے کی ضرورت نہ پڑے اور وہ ایک ہی پرواز میں منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔

نواب صدیق علی خان لکھتے ہیں کہ ــــ

"ماہرین چیختے اور سر پیٹتے ہی رہے۔ لیاقت علی خان کی بھی ایک نہ چلی قائدِاعظم پروگرام کے مطابق کراچی سے لاہور تشریف لے گئے۔ وہ اسی فرسودہ ڈکوٹہ سے انتہائی خطرہ مول لے کر مشرقی پاکستان کے پہلے اور آخری دورہ پر تشریف لے گئے اور بخیریت واپس لوٹ آئے۔"

(بے تیغ سپاہی صد ۲۶۵)

خدمتِ خلق

دینِ اسلام کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ خدا نے تمہیں جس قدر دیا ہے۔ آپ کے معیارِ زندگی سے اس کا پتہ لگنا چاہیئے۔ لیکن اس معیار کو قائم کرتے وقت

اس بات کا بھی دھیان رکھنا چاہیئے کہ وہ شرعی حدود وقیود سے تجاوز نہ کرے۔ یعنی روپے پیسے کا بے جا خرچ نہ ہو۔ نہ اس سے اظہارِ تفاخر مقصود ہو اور جو زائد از ضرورت بچے۔ اسے خدا کی امانت تصور کر کے اسکی معذور محتاج مخلوق پر خرچ کر دیا جائے کہ یہ بھی شکر کی ایک صورت ہوتی ہے۔ قائدِاعظم اس اصول پر بھی پوری طرح عمل پیرا تھے۔

قائدِاعظم جتنے ذہین وفطین، محنتی اور جفاکش تھے۔ اتنے ہی امیر کبیر بھی تھے عمدہ سے عمدہ اور بے عیب لباس پہنتے، آراستہ و پیراستہ کوٹھی میں رہتے۔ بہترین سے بہترین سواری (موٹر وغیرہ) استعمال کرتے تھے اور مہمانوں کی بھی ان کی شان کے شایاں خاطر تواضع کرتے رہتے تھے۔ بایں ہمہ آپ نے کبھی ازراہِ تفاخر و نمائش بلا ضرورت خرچ نہ کیا۔ دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود اسے عیاشی میں نہ اڑایا۔ بلکہ آپ نے بڑی پاکیزہ زندگی گزاری۔ قائدِاعظم کے ایک ذاتی دوست اور تحریکِ پاکستان کے ایک کارکن جناب اے۔ بی اکرم کے قول کے مطابق ـــــ

"ڈھیروں دولت کمانے کے باوجود کوئی اخلاقی برائی قائدِاعظم کے قریب نہ پھٹکی۔ خود تو کسی برائی میں کیا ملوث ہوتے۔ بُرے آدمی کو بھی قریب نہ پھٹکنے دیتے۔" (زندگی لاہور ۱۷ جون ۱۹۷۳ء)

زعمائے قوم میں سے یہ شرف اور سعادت صرف قائدِاعظم ہی کو نصیب ہوئی کہ جس طرح آپ نے اپنی ساری زندگی ملک وملت کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اسی طرح آپ نے اپنی کمائی سے بچائی ہوئی دولت بھی اپنے وصیت نامہ کی رو سے عوام کی فلاح وبہبود کے لئے وقف کر دی تھی تاکہ آنے والی نسلیں بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

صبر وتحمل قائدِاعظم کو اللہ تعالیٰ نے جن اوصافِ حمیدہ سے نوازا تھا۔ ان میں ایک صبر وتحمل بھی تھا جو ایک پیغمبرانہ صفت ہے اور اس کی قوتِ برداشت کے لئے روحانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ یہ اعضا جسمانی کو مضمحل کر دیتی ہے۔ قائدِاعظم میں یہ

صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔

ایک مرتبہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں آپ کی کوٹھی پر ہو رہا تھا کہ بدوران اجلاس تار کے ہرکارے نے آکر آپ کو ایک تار دیا جس میں یہ بہت بڑی پریشان کن خبر درج تھی کہ پشاور کے انتخابی حلقہ سے مسلم لیگ ہار گئی ہے اور کانگرس کے امیدوار ڈاکٹر خانصاحب انتخاب جیت گئے ہیں۔ قائداعظم نے تار پڑھکر اس کو اس طرح کاغذوں کے درمیان دبا دیا جیسے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

دوسری طرف مجلس عاملہ کے جملہ ارکان اس تشویش میں مبتلا تھے کہ ایسا کس کا تار آیا ہے جسے قائداعظم نے پرکاہ جتنی وقعت بھی نہیں دی۔ اجلاس کے خاتمہ پر جب تار کے مضمون کا انکشاف ہوا تو سب حیرت و استعجاب کی تصویر بن گئے اور آپ کی ذات پر طرح طرح کے تبصرے کرتے رہے کہ قائداعظم کتنے عظیم انسان ہیں کہ انہوں نے اس اہم ترین مگر افسوسناک خبر کا نہ صرف یہ کہ خود کوئی اثر نہ لیا۔ نہ اسے دوسروں کو سنا کر پریشان کیا۔ اگر کوئی دوسرا لیڈر ہوتا تو وہ بالیقین اس صدمہ کی تاب نہ لاکر اجلاس برخواست کر دیتا یا اس کے نتائج و عواقب کو فی الفور زیر بحث لاتا۔

یقینِ محکم

اتنے صبر و تحمل کا پیکر جب قوم کے ناقابلِ برداشت مصائب کی داستان سنتا تو پھر آب دیدہ ہو جاتا۔ ۱۹۴۶ء میں ہندوؤں نے صوبہ بہار کے مسلمانوں پر جس بیدردی سے مصائب و آلام کے پہاڑ گرائے اور جتنی بربریت و سفاکیت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی تفصیل جب آپ کی خدمت میں پیش کی گئی تو قائداعظم کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ آپ نے بڑی ہمت سے ان کو گھونٹ لیا اور گلوگیر آواز میں فرمایا:۔

"ظلم و تشدد کی حد ہو گئی ہے۔ مگر اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوجیے۔ انشاء اللہ ان ہزاروں معصوموں کے خون کا ایک ایک قطرہ اپنی پوری پوری قیمت وصول کرے گا۔ شہیدوں کا خون انشاء اللہ رائیگاں نہ جائے گا۔ اس کا بدلہ خدا عظیم الشان دے گا۔ صبر اور اتحاد کے ساتھ ڈسپلن کو قائم

رکھنا چاہیئے۔ اس وقت مسلمانوں کو اکٹھا ہونے کی ضرورت ہے۔ انتشار اور اختلافات ہمیں بہت پیچھے دھکیل دیں گے۔ صداقت پروپاگنڈے اور تنقید سے کبھی زائل نہیں کی جا سکتی۔"

دوسری مرتبہ آپ کی آنکھوں میں اس وقت آنسو دیکھے گئے۔ جب آپ نے علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی سے سرحد اور سلہٹ کا ریفرنڈم جیتنے کی استدعا کی۔

عاجزی و انکساری

یہ دنیا بڑی محسن ناشناس بلکہ محسن کش ہے۔ جس جدوجہد کے ساتھ قائدِ اعظم نے پاکستان حاصل کیا۔ وہ تاریخ عالم کا ایک مسلّمہ بے نظیر سنہری باب ہے۔ جس کا مخالفوں اور دشمنوں کو بھی مجبوراً اعتراف کرنا پڑا۔ مگر یہ کتنی محسن ناشناسی بلکہ محسن کشی ہے کہ ابھی پاکستان کو بنے ربع صدی ہی گزری تھی کہ رہنمائی و پیشوائی کے بعض نامور دعویداروں نے پاکستان کو اپنے کھاتے میں لکھنا اور لکھوانا شروع کر دیا کہ یہ میری وجہ سے عالمِ وجود میں آیا ہے۔ یہ انتہائی شرمناک ڈھٹائی ہے۔ جس سے ان لوگوں کی کم ظرفی۔ تنگ دلی اور خود غرضی ٹپکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں خود معمارِ پاکستان کے کردار پر نظر دوڑائیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس عظیم انسان نے پاکستان بنا کر بھی اسے اپنے کھاتہ میں نہیں ڈالا۔ بلکہ انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ فرمایا کہ:۔

"یہ مشیت ایزدی ہے۔ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی فیض ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی۔ وہ آج آزاد ہے۔ اس کا اپنا ملک ہے اپنا جھنڈا ہے۔ اپنی حکومت ہے اور اپنا سکہ ہے۔ جب میں یہ محسوس کرتا ہوں تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے بارگاہِ رب العزت میں سجدہ شکر بجا لانے کے لئے فرطِ مسرت سے جھک جاتا ہے۔" (آخری لمحات)

جی الانہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:۔

"یوم آزادی پر جن لوگوں نے قائدِ اعظم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں بابائے قوم

کی آنکھوں میں عجز و انکسار کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی"۔

۲۰ رجون ۱۹۴۷ء کو جب آپ نے آل انڈیا ریڈیو سے پہلی بار قوم سے خطاب کیا اور پاکستان بننے کی خوشخبری سنائی تو اس وقت بھی آپ کی آواز خلوص و عاجزی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

احترامِ ماہِ صیّام ارباب من دون اللہ کی پرستش ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ انگریزوں کے پجاریوں میں سر نواب خان بہادر اور خان صاحب ایسے خطاب یافتگان اور جاگیرداران سب سے پیش پیش رہتے اور انگریز افسروں کی چشمِ التفات کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ اگر کسی کو گورنر، گورنر جنرل، وزیرِ ہند یا وزیرِ اعظم برطانیہ کے دربار میں حاضری نصیب ہوتی تو وہ اسے "معراج" سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ پھر شاہی دربار کی حاضری تو حکام پرستوں کے لئے نورٌ علیٰ نور ہوتی تھی اور کئی اس کے لئے مدتوں ترستے ترستے زیرِ زمین اتر جاتے تھے۔

شاہِ انگلستان جارج ششم کے زمانہ میں ہندوستان کو کچھ اصلاحات دینے کی گفت و شنید کے لئے جن زعمارِ ہند کو دعوت دی گئی۔ ان میں قائدِ اعظم بھی شامل تھے اس گفت و شنید کے دوران قائدِ اعظم کو بھی بکنگھم پیلس سے شاہی ظہرانہ کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ دوسرے مدعوین تو یہ دعوت نامہ پاکر پھولے نہ سمائے۔ کیونکہ شاہی محل میں شہنشاہِ معظم۔ شاہی خاندان کے معزز افراد اور بین الاقوامی شہرت کے مالک چوٹی کے رہنماؤں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کام و دہن کی تواضع کرنے کا شرف ان کو خواب میں بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ اس لئے تمام مدعوین ظہرانے کے وقت کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ مگر قائدِ اعظم نے یہ شرف حاصل کرنے کی بجائے، آدابِ شاہی کے خلاف اس دعوت نامہ کے جواب میں یہ معذرت نامہ بھیج دیا کہ:۔

" یہ رمضان کا مقدس مہینہ ہے اس میں مسلمان روزے رکھتے ہیں"۔

مگر دوسرے مسلمان رہنماؤں کے دل میں احترامِ ماہِ صیّام کا خیال تک پیدا نہ ہوا۔

اور وہ شاہی ضیافت کے مزے اڑانے کے لئے بروقت قصرِ شاہی میں پہنچ گئے۔

ملّی معاونت

۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی گول میز کانفرنس کے خاتمہ کے بعد، اس کانفرنس کے کچھ ممتاز ممبروں نے اپنے اختلافات ختم کرنے اور برطانوی وفد کے مقابلہ میں متحدہ محاذ بنانے کے سلسلہ میں سرگرمی جاری رکھی، انتہا پسند ہندوؤں کے سوا باقی تمام جماعتوں نے مصالحانہ روّیہ اختیار کیا۔ البتہ وفاق کے مسئلہ پر مسلم وفد میں کچھ اختلاف تھا جو لوگ وفاق کے مخالف تھے ان کا خیال تھا کہ وفاق قائم ہونے کے بعد ریاستوں اور راجواڑوں کی شمولیت کی وجہ سے ہندوؤں کی غالب اکثریت ہو جائے گی۔ جس کے سامنے مسلمانوں کی حیثیت بالکل ختم ہو جائے گی اور ان کی موجودہ سیاسی اہمیّت برقرار نہ رہے گی۔

قائدِاعظم بھی وفاق کے نظریہ کے سخت مخالف تھے۔ لیکن قائدِاعظم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ گاندھی کی طرح اپنی بات منوانے کے لئے ضد نہیں کرتے تھے۔ نہ اپنی رائے کو گاندھی کی طرح اہمیت دیتے تھے۔ بلکہ معاملہ ہمیشہ جماعت کے سامنے رکھتے تھے۔ وہ اتفاقِ رائے سے جو فیصلہ کردیتی۔ اسے بلا حیل وحجت تسلیم کرلیتے تھے، خواہ وہ آپ کی رائے کے کتنا بھی مخالف کیوں نہ ہوتا۔ چنانچہ وفاق کے مسئلہ پر آپ نے مسلم وفد کی اکثریت کے فیصلہ کے پیشِ نظر اس کی مخالفت ترک کردی۔

مسلم وفد کے قائد سر آغا خان نے قائدِاعظم کے اس فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی "یادداشت" میں لکھا کہ ——

> "مجھے اس خیال سے خوشی ہوتی ہے کہ جب مسلم وفد میں ہم نے وفاق کی حمایت کا اعلان کیا۔ تو مسٹر جناح نے جو وفاق کے انتہائی مخالف تھے، اپنی مخالفت ترک کردی اور بعد میں جو مذاکرات ہوئے۔ ان کے سلسلہ میں انہوں نے ہمیشہ ہماری معاونت[1] کی۔" (میموریز آف آغا خان صد ۲۱۷)

---

[1] قرآنِ کریم کا بھی یہی فرمان ہے تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدہ ۲/۵) آپس میں نیک کاموں پر مدد کیا کرو [illegible]

اس واقعہ سے ان لوگوں کے اس خیال کی تردید ہوجاتی ہے جو قائدِ اعظم کو خود پسند ضدی اور اپنی بات پر اڑ جانے والا کہتے نہ تھکتے تھے۔

قدر شناسی

قائدِ اعظم کی روز افزوں مصروفیات، ملّی مسائل میں ہمہ وقتی انہماک آپ کو اتنی مہلت نہ دیتے تھے کہ آپ دوسروں کے انفرادی مسائل کی طرف بھی توجہ دے سکتے۔ لیکن وہ اپنے وابستگانِ دامن سے نہ بے خبر رہتے تھے۔ نہ ان سے بے التفاتی برتتے تھے۔ بلکہ انہیں بھی اپنی ہی ذات کا ایک حصّہ سمجھ کر ان کے دکھ اور درد میں برابر کے شریک رہتے تھے آپ کی شب و روز کی مصروفیات اس راہ میں حائل نہ ہوتی تھیں اور ایک مہربان، ہمدرد، شفیق دوست کی طرح ان کی خبر رکھتے تھے۔

نواب صدیق علی خاں سالارِ اعلیٰ مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور ممبر لیجیسلیٹو اسمبلی دہلی کو ۱۹۴۱ء میں سی پی کانگرس گورنمنٹ نے گرفتار کرلیا۔ کیونکہ انہوں نے سی پی کی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے وہاں ایک کانفرنس کا اہتمام کر رکھا تھا۔ جس میں خود قائدِ اعظم تشریف لا رہے تھے۔ اس کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے حکومت نے نواب صاحب کو گرفتار کرلیا جب قائدِ اعظم کانفرنس میں شرکت کیلئے تشریف لائے تو آپکو اس واقعہ کا علم ہوا جسے آپ نے کانگرسی حکومت کی زیادتی قرار دیا۔

نواب صاحب کی بیگم اپنے شوہر نامدار کی گرفتاری کی وجہ سے بہت پریشان تھیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں وہ قائدِ اعظم کی قیام گاہ پہنچیں اور آپ کی بہن سے قائدِ اعظم سے ملنے کی خواہش کی۔ محترمہ بھی اپنے بھائی کی طرح اکثر مصروف رہتی تھیں اور اس وقت خود قائدِ اعظم کانفرنس کے سلسلہ میں مصروف تھے۔ لیکن آپ اطلاع ملتے ہی اندر تشریف لائے اور بیگم موصوف سے فرمایا:-

"صدیق علی خاں کو کانگرس گورنمنٹ نے پکڑ لیا ہے۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ہمارا پہلا مسلم لیگی ہے جو دو مرتبہ جیل گیا"

اس واقعہ کی جو تفصیل محترمہ نے ریڈیو پاکستان کی نشریات اور "ماہِ نو" کے لئے

۱۰ ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو کولمبو میں قلم بند کی۔ اس میں وہ تحریر فرماتی ہیں کہ:۔

"پھر قائدِ اعظم باہر چلے گئے اور میں گھر لوٹ آئی۔ اگرچہ مجھے کسی قدر اطمینان تو ہوا لیکن بے چینی کا ازالہ نہ ہو سکا۔ دوسرے روز صبح ناگ پور کے ممتاز لیڈر ابراہیم خاں فنا نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ قائدِ اعظم نے اپنی ورکنگ کمیٹی میں میرے شوہر کی رہائی کے لئے مطالبہ کی تجویز پاس کی اور اسی وقت یعنی رات کے ایک بجے چیف سیکرٹری سی پی گورنمنٹ کو روانہ کر دی اور جب تک جواب موصول نہ ہوا۔ آپ برابر برآمدے میں ٹہلتے رہے اور بے چین رہے۔"

اس سے اندازہ ہوا کہ آپ اپنے رفقار کار سے کتنا شفقت آمیز اور ہمدردانہ سلوک کرتے تھے۔ رات کو ایک بجے چٹھی روانہ کرنے کے بعد گئی رات تک جواب کے انتظار میں بے چین رہنے کی کسی اور لیڈر سے توکبھی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی دوران عید قربان آگئی۔ خاوند کی گرفتاری کے زمانہ میں بیوی نے کیا عید منانی تھی۔ قائدِ اعظم کو ان کا اتنا خیال تھا کہ آپ معہ اپنی ہمشیرہ محترمہ جب عید گاہ نماز کے لئے جا رہے تھے تو نواب صاحب کی بیگم کی دلجوئی کے لئے قائدِ اعظم اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ ان کے گھر پہنچ گئے۔ اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے تاکہ وہ عید کے دن گھر میں تنہائی محسوس نہ کریں۔ آپ کی اس شفقت و عنایت نے ان کا سارا غم غلط کر دیا۔ ایسی عظیم شخصیت کے متعلق خود پسندی اور تند خوئی کا بہتان باندھنا آسمان پر تھوکنے کے برابر ہے۔

حقیقت پسندی قائدِ اعظم بڑے حقیقت پسند انسان تھے۔ جھوٹ اور مبالغے کو بالکل پسند نہ کرتے تھے اور جس کام اور جس بات کے لئے خود کو نا اہل پاتے اس کے اظہار و اعتراف میں قطعاً تامل یا گریز نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ کے بعض عقیدت مندوں نے آپ کے لئے امیر المومنین کا لقب استعمال کیا۔ آپ نے یہ فرما کر انہیں فی الفور ایسا کرنے سے روک دیا کہ:۔

"میں نہ مذہبی پیشوا ہوں اور نہ روحانی رہنما۔ اس لیے میں اس لقب کا خود کو سزاوار نہیں پاتا۔" (قائدِ اعظم میری نظر میں ص۲۷)

آپ خوشامد اور غیر ضروری تعریف بھی سننا پسند نہ کرتے تھے اور ہمیشہ اپنی حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ کے ایک جلسہ میں "مولانا محمد علی جناح زندہ باد" کا نعرہ لگا دیا۔ کیونکہ اس وقت آپ حاضرین کو دینی تقاضوں کا احساس دلا رہے تھے۔ آپ نے نعرہ لگانے والے کو فوراً روک کر فرمایا:۔

"میں عالم دین نہیں ہوں۔ میں تو ایک سیاسی لیڈر ہوں۔ تم مجھے مسٹر جناح یا محمد علی کہہ سکتے ہو۔ مجھے مولانا ہرگز نہ کہو۔"

اگر کوئی آپ کی بے جا تعریف کرنے لگتا تو آپ فوراً بات کاٹ کر اُسے روکتے۔ ایک دوسرے جلسہ کے موقعہ پر سامعین میں سے کسی نے آپ کی تقریر دلپذیر سے متاثر ہو کر "شاہِ پاکستان" کا نعرہ لگایا۔ آپ فوراً اس سے مخاطب ہوتے کہ:۔

"میں بادشاہ نہیں۔ میں تو پاکستان کا خادم ہوں۔"

غرض آپ اپنے اوپر کوئی ایسا لیبل چسپاں نہ ہونے دیتے تھے۔ جس کے آپ اہل نہ ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ ای وارڈ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ بمبئی کے کارکن قائدِ اعظم کو ایک جلسہ میں شرکت کی دعوت دینے گئے۔ ان میں سے ایک شخص نے بدوران مصافحہ جوشِ عقیدت سے قائدِ اعظم کا ہاتھ چوم لیا۔ جس پر آپ نے فرمایا کہ:۔

"لوگوں کو چاہیئے کہ وہ مجھے معمولی آدمی تصور کریں۔ پیر و مرشد نہ سمجھ لیں اس طرح لوگوں میں غلط اور تباہ کن طریقہ پر سر جھکانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ جسے عرفِ عام میں شخصیت پرستی کہتے ہیں۔ یہ مرض نقصان دہ اور مضرت رساں ہے اور اسلام میں ناروا اور ناجائز ہے۔"

(روزنامہ انقلاب بمبئی ۲۵، دسمبر ۱۹۴۵ء)

جرأت و حق گوئی قائدِ اعظم کی پارلیمانی زندگی کا آغاز ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ جب آپ بمبئی کے مسلم حلقہ سے سپریم لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اس زمانہ میں، ہیر پھیر، جُھرلو یا الیکشن دین کی بنار پر ممبر منتخب نہ ہوتے تھے۔ بلکہ اس کونسل کے لئے وہ حضرات منتخب کئے جاتے تھے۔ جو ذہانت، فطانت اور قابلیت میں ملک بھر میں سرِ فہرست ہوتے تھے۔ اس کونسل کا مستقل صدر خود وائسرائے ہوا کرتا تھا۔ اس کے کرسئی صدارت سنبھالنے کے بعد کسی کی یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ وائسرائے کی موجودگی میں کوئی ایسا لفظ منہ سے نکالے جو حکومتِ برطانیہ پر تنقید کا درجہ رکھتا ہو۔ یا جس سے اس کی اپنی وفاداری یا وفا شعاری مشکوک ہو جائے۔ اس لئے کم و بیش ہر ممبر وائسرائے کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے مصلحت کوشی یا مصلحت بینی سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اگر کسی کو جرأت بھی ہوتی تو صرف اتنی کہ وہ دبی زبان سے اس انداز میں بات کرتا کہ جس کا کوئی اثر یا نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔

یہ قائدِ اعظم کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اگرچہ آپ لندن کی تازہ ہوا کھا کر ابھی لوٹے ہی تھے۔ مگر اس فضا کے خوشگوار اثرات بھی بطور یادگار ہمراہ لائے تھے۔ یعنی آپ نے ان کی تہذیب و تمدن کی خرابیوں کو نظر انداز کر کے اس کی صرف خوبیاں ہی اپنا رکھی تھیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کی کارروائیوں کے مطالعہ و مشاہدہ نے آپ کو آئین پسند اور جمہوریت کا شیدائی بنا دیا تھا۔

اس کے علاوہ اس دور کے مشاہیر دادا بھائی نوروجی، سر فیروز شاہ مہتہ۔ گوپال کرشنا گوکھلے اور مسٹر رانڈے کی معتدل معیت اور صحت مند صحبت نے سونے پر سہاگہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے آپ خودداری و حق گوئی کے پیکر بن گئے تھے۔

کونسل مذکور میں ایک مرتبہ جنوبی افریقہ کی گوری حکومت کی بربریت زیرِ بحث آگئی جس کے متعلق قائدِ اعظم نے اپنی تقریر میں "بے رحمی" کا نرم ترین لفظ استعمال کیا۔ جس پر لارڈ منٹو وائسرائے ہند بہت بگڑے۔ کیونکہ برطانوی ہند کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہندوستانی نے برطانوی حکومت کو اس طرح ہدفِ تنقید بنایا ہو۔ اس لئے وائسرائے نے آپ سے

یہ الفاظ واپس لینے کا شدید مطالبہ کیا۔ مگر یہ جوانمرد وائسرائے سے کب دبنے والا تھا۔
اس نے انتہائی شائستگی اور تہذیب کے ساتھ وائسرائے سے کہا:۔

"تقاضائے طبع تو اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرنے کو چاہتا ہے
لیکن ایوان کے قوانین کے پیش نظر یہ کہتا ہوں کہ ہندوستانی مزدوروں کے
ساتھ ایسا "بے دردانہ" سلوک کیا گیا ہے جو تصور میں بھی نہیں آسکتا"!

(بے تیغ سپاہی صد ۱۶)

اس برجستہ جواب سے لارڈ منٹو وائسرائے ہند پر بہت دیر تک سکتہ ساطاری
رہا اور اخبار والوں کے ہاتھ میں سونے کی چڑیا آگئی۔ جو دوسرے روز ہندوستان کے
نامور اخبارات کی پیشانیوں پر بیٹھی جناح زندہ باد کے نغمے گا رہی تھی۔ اخباروں نے
اس خبر کو اس طرح اچھالا کہ وائسرائے بہادر بھنا کر رہ گئے۔ اس جرأت مندانہ اقدام نے
قائداعظم کو عوام و خواص کی نظروں میں محبوب و مقبول بنا دیا۔

ہمّت و قوت

۲۶ر جنوری ۱۹۴۳ء کو ایک خاکسار قائداعظم کو ملنے کے بہانے
ان کے مکان واقعہ بمبئی میں داخل ہوا اور ایک گہری سازش کے تحت قائداعظم کو اکیلا پا
کر آپ پر خنجر سے قاتلانہ حملہ کر دیا۔ جس سے آپ کے چہرے اور گردن پر زخم آئے۔ مگر
مولا کریم نے قوم کے اس ناخدا کو اپنے فضل و کرم سے بچا لیا۔ اس وقت آپ تقریباً ستّر
سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ نحیف و نزار اتنے کہ آہستہ سے چھونے پر بھی اپنا جسمانی توازن
قائم نہ رکھ سکیں اور حملہ اتنا شدید تھا کہ شاید ایک نوجوان عمر بھی اسے برداشت نہ کر سکتا
مگر آپ نے اپنی حاضر دماغی سے قاتل کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر اتنی قوت سے نیچے
دبایا کہ وہ ہل بھی نہ سکا اور سیکرٹری کو ساتھ والے کمرے سے بلا کر اُسے گرفتار کرا دیا۔
اس سے اندازہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اتنی بڑی عمر میں بھی آپ کو بڑی قوت اور
ہمت دے دی تھی کہ آپ نے اپنے نوجوان قاتل کو ہلنے نہ دیا اور جب دوست احباب نے
پوچھا تو آپ نے حسن اصفہانی کو فرمایا کہ:۔

"میں نے اس بزدلانہ حملہ میں اپنا سکون و اطمینان قائم رکھا اور اس طرح
عمل کیا۔ گویا کوئی قابلِ ذکر بات واقع نہ ہوئی ہو"
(قائدِ اعظم میری نظر میں صہ۲۳۲ جریدی)

اس خبر کے نشر اور شائع ہوتے ہی مسلمانانِ ہند میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی اور خیریت معلوم کرنے کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ سے ہزاروں کی تعداد میں تار آ گئے جن کی وجہ سے آپ نے یہ اخباری بیان جاری کیا۔

"اگرچہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ تاہم خدا کے فضل و کرم سے میرے
کوئی شدید زخم نہیں آیا۔ میں اس وقت کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مگر مسلمانوں سے
پُرامن رہنے کی اپیل کرتا ہوں۔ ہم سب کو شکر کرنا چاہیئے کہ میں معجزانہ طور
پر بچ گیا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ مجھ پر یہ بزدلانہ حملہ ایک
مسلمان نے کیا ہے" (قائدِ اعظم جناح صہ۴۱۹)

اس زمانہ میں صوبہ سرحد میں ایک ضمنی الیکشن ہو رہا تھا۔ جہاں ایک مسلم لیگی وفد پہنچا ہوا تھا۔ آپ پر قاتلانہ حملہ کی خبر سنکر پٹھانوں نے فکر و پریشانی میں اس وفد کی قیامگاہ پر دھاوا بول دیا کہ ہمیں اخباری خبروں پر کوئی اعتبار نہیں۔ ہم خود قائدِ اعظم کی زبان سے سننا چاہتے ہیں کہ وہ صحیح سلامت ہیں۔

چنانچہ اسی روز قائدِ اعظم کو فون کیا گیا تو آپ نے فون پر فرمایا :۔

"میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جایئے۔ اور اپنی تمام تر قوت
انتخاب جیتنے پر مرکوز کر دیجئے جو ہم پاکستان کی بنیاد پر لڑ رہے ہیں"

اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس علاقہ میں کانگریسیوں کے خلاف زبردست جوش و خروش پھیل گیا اور مسلم لیگ نے وہ ضمنی انتخاب جیت لیا۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوا ہوتا تو شاید نتیجہ الٹ نکلتا۔

فرض شناسی

قائدِ اعظم بڑے محتاط طبع تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب

آپ نے بحیثیت گورنر جنرل چارج سنبھالا تو اس وقت محکمہ قانون میں ایسے تربیت یافتہ افراد کی کمی تھی جو قانون کے مسودے تیار کر سکتے۔ اس لئے وقتی ضرورت کے تحت کچھ بلوں اور آرڈی ننسوں کے مسودے جلدی میں تیار کر لئے گئے تھے۔ مگر عام دستور کے مطابق قائدِاعظم ان پر دستخط کر دینے کے عادی نہ تھے۔ آپ کو اپنی ذمہ داری کا بڑا احساس تھا آپ ہر مسودہ کا جب تک ایک ایک لفظ اور ایک ایک سطر خود بغور پڑھ کر مطمئن نہ ہو لیتے، اس وقت تک کسی قانون پر منظوری کے دستخط نہیں فرماتے تھے۔ کسی دستاویز پر اس کا مطلب اور مفہوم سمجھے بغیر آپ دستخط کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے تاکہ ان کی انتظامیہ من مانی نہ کر سکے۔ بلکہ بڑی محتاط اور مستعد رہے۔

اس لئے آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ :-

" حکام کو مجھ سے توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ انہوں نے کسی مناسب عذر کے بغیر کسی معاملہ میں تاخیر سے کام لیا تو میں ان کا ساتھ دوں گا "

(قائدِاعظم جناح صد ۶۰)

آپ کے پرائیویٹ سیکرٹری ایس ایم یوسف کا بیان ہے کہ :-

" ایک صوبائی حکومت نے صوبائی قانون ساز اسمبلی کے اجلاس سے چند روز قبل ایک آرڈی ننس کے نفاذ کی منظوری کی درخواست کی مگر آپ نے اس کی منظوری نہ دی کیونکہ اس طرح قانون ساز اسمبلی کی بالادستی پر حرف آتا تھا " (ڈان)

علالت اور خرابیٔ صحت کے باوجود آپ اخیر وقت تک اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے رہے اور اہم امورِ مملکت سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ گورنر جنرل بننے کے بعد آپ نے کبھی آرام تک نہ کیا اور ہمہ وقت امورِ مملکت میں منہمک رہے۔

وزیرِاعظم حیدر آباد میر لائق علی جب آپ کو ملنے دہلی سے ستمبر ۱۹۴۷ء میں لاہور آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے آپ کو دن بھر میں صرف ایک گھنٹہ ملاقات کی اجازت دے رکھی ہے۔ میر لائق علی کو دن کے گیارہ بجے سے بارہ بجے تک اس شرط پر ملنے کی

اجازت ملی کہ اُس روز قائدِاعظم اور کوئی کام نہ کریں گے ـــــــــ حیدرآباد اور کشمیر کے مسائل زیرِغور آنے کی وجہ سے ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود آپ نے میر صاحب سے تین گھنٹے تک بات چیت جاری رکھی ۔ یہاں تک کہ ایک بجے کھانے کا وقت بھی گزر گیا اور آپ کچھ نڈھال ہو گئے ۔ جس پر میر لائق علی خود اٹھ کر چلے آئے ۔ اس کے بعد آپ کو حرارت ہو گئی اور کئی روز تک ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل نہ کرنے کے باعث طبیعت ناساز رہی مگر آپ امورِمملکت کو صحت پر فوقیت بخشتے رہے اور اس کا حق پورا پورا ادا کرتے رہے اور قدم قدم پر فرض شناسی کا ثبوت دیتے رہے ۔

حوصلہ افزائی

۱۹۴۳ء میں قائدِاعظم جب کوئٹہ تشریف لے گئے تو آپ کے اعزاز میں بڑے جلسے اور بڑی پارٹیاں ہوئیں ۔ ایک دعوت میں سر شیخ عبدالقادر مرحوم بھی قائدِاعظم کے پہلو میں بیٹھے تھے ۔ اس محفل میں قائدِاعظم، لارڈ لنلتھگو سے اپنی ملاقاتوں کا حال سنا رہے تھے ۔ آپ نے فرمایا :-

"وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے ایک دن مجھ سے کہا کہ :-

"مسٹر جناح ! اگر آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کئے جانے اور پاکستان بنانے کی ضد چھوڑ دیں تو وہ حکومت برطانیہ کو مائل کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت سی مراعات دیدی جائیں"۔

وائسرائے کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ "اس کا جواب میں آئندہ ملاقات میں دونگا"۔

پھر ہم وہاں سے چلے آئے ۔ چند روز بعد پھر جب وائسرائے سے ملاقات کا دن آیا ۔ تو میں ایک ریشمی رومال جیب میں ڈال کر وائسرائے کی قیامگاہ پر پہنچا ۔ اس ریشمی رومال پر پاکستان کا نقشہ سوزن کاری سے سبز رنگ میں بنایا گیا تھا ۔ جو ایک گیارہ سالہ لڑکی کا تحفہ تھا ۔ یہ لڑکی ایک یتیم وضع کے اوسط مسلمان گھرانے میں یوپی روہیل کھنڈ میں پیدا ہوئی تھی ۔ گھر میں پردہ کی سخت پابندی تھی ۔ اس لئے یہ لڑکی کسی مدرسہ میں پڑھنے کے لئے نہیں بھیجی گئی ۔ اس لڑکی نے اپنی محنت سے نہایت ذہانت کے ساتھ یہ نقشہ بنایا اور

اس کی آرزو تھی کہ وہ خود یہ بنا ہوا نقشہ کا رومال ہمیں اپنے ہاتھ سے پیش کرے۔ جب ہم دورہ کرتے ہوئے اس شہر میں پہنچے جہاں یہ لڑکی رہتی تھی تو اس کا باپ ہمارے پاس آیا اور نہایت عاجزی سے کہنے لگا:۔

"حضور! میری لڑکی نے بڑی محنت سے پاکستان کا نقشہ ایک ریشمی رومال پر بنایا ہے اور اس کی آرزو ہے کہ آپ خود چل کر اس کے ہاتھ سے یہ تحفہ قبول فرمائیں"۔

ایک پردہ نشین لڑکی کی بات تھی۔ لہٰذا مصروفیات کی کثرت کے باوجود ہم نے اس لڑکی کی درخواست کو رد نہ کیا اور اس کے گھر جا کر اس کے ہاتھ سے یہ تحفہ قبول کیا اور اپنے پاس سنبھال کر رکھا۔ جب میں نے یہ رومال وائسرائے کو دکھایا تو وہ اسے دیکھ کر بنانے والی کی دستکاری کی تعریف کرنے لگے اور جب میں نے اس لڑکی کی عمر اور اس کی گھریلو زندگی کا حال سنایا تو وائسرائے کو بہت تعجب ہوا۔ اس پر میں نے وائسرائے سے کہا:

"آپ اور آپ کی حکومت برطانیہ یہ سمجھتی ہے کہ محمد علی جناح لوگوں کو سکھاتا ہے کہ وہ پاکستان کا مطالبہ کریں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال اس ملک کے ہر مسلمان مرد، عورت، بوڑھے، بچے اور نوجوان طبقے کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور جب میں اس پر زور دیتا ہوں تو صرف اپنی قوم کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہوں"۔

وائسرائے رومال پر کشیدہ نقشہ دیکھ کر اور اس کو بنانے والی گیارہ سالہ لڑکی کے حالات سن کر بہت متاثر ہوا اور اس پر واضح ہو گیا کہ پاکستان کا تخیل پردہ نشین خواتین اور چھوٹی چھوٹی بچیوں کے دلوں تک پہنچ چکا ہے اور اب اس خیال کو بدلا نہیں جا سکتا"۔

یہ واقعہ خود سر عبدالقادر مرحوم نے ممتاز صحافی شفیق بریلوی سے بیان کیا جنہوں نے اسے اپنے ایک اخباری بیان کی زینت بنایا۔ یہ اس بچی کا خلوص تھا جو قائداعظم کو اس کی حوصلہ افزائی کے لئے کشاں کشاں اس کے گھر تک لے آیا۔ یہ قائداعظم کی حوصلہ افزائی

تھی ۔ جس نے اسے تاریخی حیثیت بخش دی ۔
کسی نے سچ کہا ہے کہ جوہر کی جوہری ہی شناخت کر سکتا ہے ۔ یہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہوتی ۔ اسی طرح قائدِ اعظم جہاں بھی جوہر قابل پاتے اس کی حوصلہ افزائی فرماتے ۔

ذرّہ نوازی

قائدِ اعظم کا جس طرح ظاہر و باطن یکساں تھا ، اسی طرح آپ کی سیاسی اور معاشرتی زندگی بھی ایک جیسی تھی ۔ ان میں کبھی کوئی نمایاں فرق محسوس نہ کیا گیا ۔ اربابِ فہم و نظر بڑے آدمیوں کے حسنِ سلوک کا اندازہ ملازموں سے برتاؤ کی بنیاد پر لگایا کرتے ہیں اِس پیکرِ انسانیت کا اپنے سے کم تر لوگوں سے حسنِ سلوک کی داستان ان کے ایک ڈرائیور مسٹر آزاد نے یوں بیان کی ،۔

" ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ قائدِ اعظم کے ہاں ڈرائیور کی اسامی خالی ہے ۔ میں نے ایک سیٹھ کے ہاں چند دن رہ کر موٹر ڈرائیوری کی شُد بُد حاصل کر لی تھی ۔ چنانچہ میں قائدِ اعظم کی کوٹھی پر پہنچ گیا ۔ وہاں اور بھی بہت سے ڈرائیور بطور امیدوار موجود تھے ۔ قائدِ اعظم کمرہ سے باہر آئے اور سب پر ایک نظر ڈالی میرا نام پوچھا ، میں سیدزادہ اور خاصا تنومند تھا ۔ غالباً انہی دو باتوں کی وجہ سے انہوں نے اپنے سیکرٹری کو کہا کہ اسے رکھ لو ۔

پہلے ہی دن حکم ہوا کہ صاحب کو لیکر کہیں جانا ہے ۔ قائدِ اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے ۔ میں نے گاڑی سٹارٹ کی تھوڑا سا دھکا لگا لیکن میں نے گاڑی چلا دی ۔ دروازے سے نکل کر سڑک پر آیا ۔ آگے ایک موڑ تھا جہاں ٹریفک کی سُرخ بتی کی وجہ سے مجھے رکنا پڑا ۔ جب سبز بتی روشن ہوئی تو میں نے پھر گاڑی سٹارٹ کی اور ایکسیلیٹر پہ پاؤں رکھا تو گاڑی زبردست دھچکہ کے ساتھ چل کر رک گئی ۔ ظاہر ہے میں اناڑی تھا ۔ قائدِ اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح بہت پریشان ہوئے ، گھر سے دوسری گاڑی

اور دوسرا ڈرائیور بلایا اور آگے روانہ ہوئے۔

میری نالائقی تو ظاہر ہو ہی چکی تھی لیکن انہوں نے مجھے ملازمت سے جواب نہ دیا بلکہ میری ڈیوٹی باورچی خانہ میں لگادی اور ہدایت کی کہ ساتھ ڈرائیوری بھی سیکھتے رہو۔"

اگر قائدِ اعظم کی جگہ کوئی دوسرا امیر کبیر ہوتا تو اسی وقت اسے گالیاں اور دھکے دیکر باہر نکال دیتا۔ اتنی فراخ حوصلگی اس طبقہ میں عنقا ہی رہی ہے۔ آپ کا سب ملازمین سے ایسا ہی حسنِ سلوک تھا۔

شفقت و رحم دلی | قائدِ اعظم بڑے رحمدل اور شفیق انسان تھے۔ آپ نے اس سیدزادہ کو نہ صرف یہ کہ ملازمت سے نہ نکالا بلکہ اس کی اصلاح کے لئے بھی کوشاں رہے تاکہ ایک نوجوان جو قوم کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ضائع نہ ہوجائے۔ ڈرائیور مذکور کا کہنا ہے کہ:-

"میں نوجوان تھا اور پھر بمبئی جیسا رنگین شہر —— اکثر راتوں کو باہر رہتا تھا۔ قائدِ اعظم کو پتہ چلا تو انہوں نے مجھے بلاکر کہا کہ:-

"تم خراب ہونے جارہے ہو۔ اب تمہاری شادی ہونی چاہئے۔"

اس کے چند دنوں بعد قائدِ اعظم نے بمبئی کے ایک معزز سید گھرانے میں میری شادی کرادی اور انہوں نے بھی اس خیال سے اس رشتہ کو قبول کرلیا کہ "یہ آزاد قائدِ اعظم کا ایک غلام ہے۔" (ستیارہ ڈائجسٹ ۱۹۷۶ء)

اقرباشناسی | امیر طبقہ اکثر اپنے غریب رشتہ داروں کو نظر انداز کردیتا ہے بلکہ بسا اوقات نخوت و رعونت میں رشتہ سے بھی انکار کردیتا ہے۔ مگر قائدِ اعظم اپنے غریب عزیزوں، رشتہ داروں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور وہ دیکھنے والے ہاتھ سے ان کی باقاعدہ ماہانہ امداد اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ آپ کے ڈرائیور مسٹر آزاد سید کا بیان ہے کہ:-

"قائدِاعظم ہر ماہ ساڑھیوں اور مردانہ سوٹوں کے کچھ بنڈل اور لفافوں میں بند کچھ سَو سَو کے نوٹ میرے ہاتھ ممبئی میں مقیم اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھجوایا کرتے اور مجھے تاکید کرتے کہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا"۔ (بحوالہ صدر)

پاسِ احساس

پروفیسر ریاض حسن لکھتے ہیں کہ:۔

"قائدِاعظم پاکستان کے تمام صوبوں کے لوگوں سے برابر کا پیار کرتے تھے۔ ان کی نظر میں تمام پاکستانی ایک قوم تھے۔ جس میں علاقائی قومیتیں بے معنی تھیں۔ وہ صوبائی قومیتوں کو نہیں پہچانتے تھے۔ ان کے ایک سیکرٹری جو پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں کہ قائدِاعظم بحالی صحت کے لئے "چمن" میں مقیم تھے۔ میں ان کا پرسنل سیکرٹری مقرر ہو کر نیا نیا کراچی سے آیا تھا۔ ایک دن غالباً کسی کام میں مجھ سے کوتاہی ہو گئی۔ محترمہ فاطمہ جناح نے مجھے سرزنش کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ:۔

"تم پنجابی لوگ ہوتے ہی بدھو ہو"۔

قائدِاعظم ساتھ والے کمرے میں تھے انہوں نے جب یہ فقرہ سُنا تو کڑک کر کہا "فاطمہ اِدھر آؤ"۔ محترمہ جب ان کے سامنے گئیں تو قائدِاعظم نے بڑے دُکھ سے فرمایا:۔

"فاطمہ! تُو نے میری تمام زندگی کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا"۔

پھر مجھے یاد فرمایا۔ میں ڈرتا ڈرتا حاضر ہوا۔ فرمانے لگے:۔

"آپ نے ابھی جو فقرہ سُنا ہے۔ اس کے بعد غالباً آپ کے لئے یہاں رہنا باعثِ اذیت ہو گا۔ آپ واپس کراچی سیکرٹریٹ تشریف لے جائیں"۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قائدِاعظم کو دوسروں کے احساسات کا کتنا پاس تھا۔ آپ حتی الوسع کسی کی رنجیدگی برداشت نہ کرتے تھے اور سیاست و معاشرت میں کوئی فرق روا نہ رکھتے تھے۔

حسنِ معاملت | آپ معاملہ کے بڑے صاف تھے اور انہی لوگوں کو اپنا قرب بخشتے تھے اور انہی پر اعتماد کرتے تھے جو لین دین کے معاملہ میں دیانتداری کے اصول پر پورے اترتے تھے۔ اگر آپ کو ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا تو احتیاط برتنا شروع کر دیتے اور جب یقین ہو جاتا کہ وہ معاملہ کا صاف نہیں ہے۔ اس کی تحویل میں جو روپیہ دیا جاتا ہے اس کا حساب نہیں دیتا تو آپ فی الفور اسے علیحدہ کر دیتے تھے۔ علیحدہ کئے جانے والوں میں بعض بڑے پایہ کے لوگ بھی تھے جو بلند مرتبہ عہدوں پر فائز رہے یا اس وقت فائز تھے چونکہ آپ کسی بددیانت یا بدمعاملہ آدمی کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس لئے ایسے لوگ آپ پر طرح طرح کے بہتان تراشتے رہتے تھے۔

عالی ظرفی | قائدِ اعظم بڑے سنجیدہ دل و دماغ کے انسان تھے۔ آپ میں چھچھورا پن نام کو بھی نہ تھا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہندوؤں کی تنگ دلی اور تعصب انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ تعلیمی ادارے بھی اس کی لپیٹ میں آچکے تھے اور ہندوؤں نے الہ آباد یونیورسٹی کے ہال پر کانگرس کا جھنڈا لہرا رکھا تھا جو مسلمانوں کو مشتعل کر رہا تھا۔

حسنِ اتفاق سے انہی دنوں پنجاب یونیورسٹی یونین کا انتخاب ہوا۔ جس میں کامیاب ہونے والے نوجوان نے قائدِ اعظم سے پنجاب یونیورسٹی پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کی درخواست کی لیکن قائدِ اعظم نے اس جوابی کارروائی کو سخت ناپسند فرمایا اور اس نوجوان کی درخواست کو یہ فرما کر مسترد کر دیا کہ:۔

> "جس کام کے لئے ہم دوسروں کو مطعون کرتے ہیں۔ وہ خود کیوں کریں؟ تمہاری کامیابی باعثِ مسرت ہے لیکن ہمارا ظرف بڑا ہونا چاہیئے۔ طاقت حاصل کرکے اپنے غلبہ کی اس طرح نمائش نہ کرو کہ دوسروں کی دل آزاری ہو۔"

عیب پوشی | قائدِ اعظم کو دیانتداری۔ پاکبازی۔ نیک نیتی۔ جفاکشی۔ بلند ہمتی اور

عالی ظرفی کے ساتھ ساتھ فراخدلی کا جذبہ بھی وافر ملا تھا۔ آپ کے دوست مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں کہ:۔

"قائدِاعظم کے کردار کا ایک نمایاں پہلو، ان کا اعتماد اور بھروسہ تھا۔ یا تو وہ کسی پر سولہ آنے اعتماد کرتے تھے یا بالکل نہ کرتے تھے۔ اگر آپ کسی پر ایک دفعہ اعتماد کر لیتے تو پھر جھجکتے نہ تھے۔ سوائے اس کے کہ بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتے۔ جس شخص پر اس طرح اعتماد کیا جاتا اگر وہ کوئی ایسا کام کر بیٹھتا جس کا نتیجہ اچھا نہ نکلتا تو اُسے نہ تو کوئی سزا دی جاتی اور نہ ہی اس پر اپنے مؤقف کو فروخت کر دینے کا شبہ کیا جاتا۔ وہ توجہ کرتے ہیں بڑے فراخدل واقع ہوتے تھے اور دوسروں سے مقاصد منسوب نہ کرتے تھے بلکہ یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ اس نے رائے قائم کرنے میں غلطی کی ہے۔ اس نے یہ اس لئے نہیں کیا کہ لیگ کی بیخ کنی کرے"۔

قائدِاعظم کی دوسری بڑی خوبی جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ تھی کہ:۔

"محمد علی جناح وفاداری کا بدلہ وفاداری سے دیتے تھے، وہ منتقم مزاج نہ تھے۔ ان کی فیاضی مناسب وقت پر اور سب خیالات پر غالب آجاتی تھی اور وہ ان لوگوں کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے جنہوں نے کبھی حسبِ استطاعت کوئی خدمت انجام دی تھی۔ لیکن خود اپنی غلط کاریوں کی بدولت اب کسی منصب پر مامور نہ تھے"۔ (قائدِاعظم میری نظر میں)

معذرت خواہی | قائدِاعظم اپنے پرائے میں قطعاً کوئی امتیاز نہ برتتے تھے۔ سب سے آپ کا سلوک یکساں ہوتا تھا۔ آپ کی ہمشیرہ محترمہ نے اپنی ساری عمر اپنے اس عظیم بھائی کی خدمت میں گزار دی اور شادی تک نہ کی، گھر کا تمام کاروبار اور کھانے پینے کا تمام کام آپ کے ذمے تھا۔ جس میں قائدِاعظم کوئی دخل نہ دیتے تھے۔ اگر آپ کی ہمشیرہ کبھی تنک مزاجی دکھاتی

عالی ظرفی کے ساتھ ساتھ فراخدلی کا جذبہ بھی وافر ملا تھا۔ آپ کے دوست مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں کہ :-

" قائداعظم کے کردار کا ایک نمایاں پہلو، ان کا اعتماد اور بھروسہ تھا۔ یا تو وہ کسی پر سولہ آنے اعتماد کرتے تھے یا بالکل نہ کرتے تھے۔ اگر آپ کسی پر ایک دفعہ اعتماد کر لیتے تو پھر جھجکتے نہ تھے۔ سوائے اس کے کہ بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتے۔ جس شخص پر اس طرح اعتماد کیا جاتا اگر وہ کوئی ایسا کام کر بیٹھتا جس کا نتیجہ اچھا نہ نکلتا تو اُسے نہ تو کوئی سزا دی جاتی اور نہ ہی اس پر اپنے مؤقف کو فروخت کر دینے کا شبہ کیا جاتا۔ وہ توجہ کرنے میں بڑے فراخدل واقع ہوتے تھے اور دوسروں سے مقاصد منسوب نہ کرتے تھے بلکہ یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ اس نے رائے قائم کرنے میں غلطی کی ہے۔ اس نے یہ اس لئے نہیں کیا کہ لیگ کی بیخ کنی کرے"۔

قائداعظم کی دوسری بڑی خوبی جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ تھی کہ :-

" محمد علی جناح وفاداری کا بدلہ وفاداری سے دیتے تھے، وہ منتقم مزاج نہ تھے۔ ان کی فیاضی مناسب وقت پر اور سب خیالات پر غالب آجاتی تھی اور وہ ان لوگوں کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے جنہوں نے کبھی حسبِ استطاعت کوئی خدمت انجام دی تھی۔ لیکن خود اپنی غلط کاریوں کی بدولت اب کسی منصب پر مامور نہ تھے"۔ (قائداعظم میری نظر میں)

معذرت خواہی | قائداعظم اپنے پرائے میں قطعاً کوئی امتیاز نہ برتتے تھے۔ سب سے آپ کا سلوک یکساں ہوتا تھا۔ آپ کی ہمشیرہ محترمہ نے اپنی ساری عمر اپنے اس عظیم بھائی کی خدمت میں گزار دی اور شادی تک نہ کی، گھر کا تمام کاروبار اور کھانے پینے کا تمام کام آپ کے ذمے تھا۔ جس میں قائداعظم کوئی دخل نہ دیتے تھے۔ اگر آپ کی ہمشیرہ کبھی تنک مزاجی دکھاتی

یا بگڑ جاتی اور روٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلی جاتی تو کسی کے سامنے نہ جھکنے والا قائدِاعظم خود اٹھ کر اس کے کمرے میں جاکر اسے مناتا تھا۔

قائدِاعظم حتی الوسع کسی ملازم کو بھی شکایت کا موقع نہ دیتے، اگر کبھی منہ سے کوئی سخت سست کلمہ نکل جاتا تو تھوڑی دیر بعد اُسے بلا کر نرمی سے فرماتے:۔

"میں بوڑھا آدمی ہوں۔ اس لئے اگر کوئی سخت لفظ میری زبان سے نکل گیا ہے تو اُسے بھلا دو"

عیدین کے موقع پر آپ مصافحہ کرنے سے احتراز کرتے تھے بلکہ صاف انکار کر دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ:۔

"میرے لئے سب مسلمان برابر ہیں۔ اگر میں عبداللہ ہارون سے ہاتھ ملاؤنگا تو دوسرے لاکھوں مسلمان جو اس وقت عیدگاہ میں جمع ہیں تو انہیں کیسے انکار کرسکوں گا"

احترامِ رفقاء قائدِاعظم کا جہاں اپنے گھروالوں اور ملازموں کے ساتھ یہ حُسنِ سلوک تھا۔ وہاں اپنے مخلص اور دیانتدار رفقاء اور کارکنوں کا بھی آپ دل سے احترام کرتے تھے اور انہیں برسرِعام عزت بخشتے تھے تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کی قدر کریں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں شریک ہونے کے لئے جب آپ راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر حسن اصفہانی اور اپنی ہمشیرہ محترمہ کے ہمراہ پنڈال کے دروازے پر اترے تو راجہ محمود آباد اور مسٹر اصفہانی پیچھے رُک گئے تاکہ آپ حسبِ معمول قائدانہ شان کے ساتھ اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ اسٹیج پر تشریف لے جائیں۔ مگر آپ رُک گئے اور فرمایا:۔

"آؤ! ہم چاروں ایک ہی قطار میں چلیں"

اس وقت قریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ گیٹ اور اسٹیج کے درمیان ایک سو گز کا فاصلہ تھا جو یہ حضرات طے کر رہے تھے۔ پُرزور تالیوں اور تحسین و آفرین کے نعروں سے آپ کا

استقبال کیا جا رہا تھا۔ جب سٹیج کے قریب پہنچنے لگے تو فرمایا:-

"میرے بچو! کیا تمہیں یہ منظر دیکھ کر خوشی نہیں ہو رہی۔ تم یہ بڑا مجمع دیکھ رہے ہو جو آج رات یہاں اکٹھا ہے۔ کیا ہم ایک تھوڑی مدت میں بہت آگے نہیں آ گئے۔ میں تم دونوں کو آج رات اپنے ہمراہ اس لئے رکھنا چاہتا تھا کہ تم دونوں نے لیگ کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے بارے میں اپنے استحسان اور خوشنودی کا اظہار کروں اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ دیکھنے کا موقع فراہم کروں"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قائدِ اعظم صرف مردم شناس ہی نہیں تھے، قدر شناس اور خوش مذاق بھی تھے۔

خوش ذوقی

قائدِ اعظم کا سیکرٹری مطلوب بڑا وجیہہ آدمی تھا۔ جتنے ڈرائیور تھے سب کے سب جسمانی صحت کا بہترین نمونہ تھے، کوٹھی کے پاسبان بھی اسی نقطۂ نظر سے چنے جاتے تھے۔ اس کا نفسیاتی پس منظر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جناح مرحوم خود بہت ہی لاغر اور نحیف تھے مگر طبیعت چونکہ بے حد مضبوط اور کسرتی تھی اس لئے کسی ضعیف اور نحیف شئے کو خود سے منسوب ہوتا پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ چیز جو انسان کو مرغوب اور پیاری ہو۔ اس کے بناؤ سنگھار کا وہ خاص اہتمام کرتا ہے۔ چنانچہ قائدِ اعظم کو اپنے صحت مند اور طاقت ور ملازموں کی پوشش کا بہت خیال رہتا تھا۔ پٹھان چوکیدار کو حکم تھا کہ وہ ہمیشہ اپنا قومی لباس پہنا کرے۔ آزاد پنجابی نہیں تھا کبھی کبھی ارشاد ہوتا کہ پگڑی پہنے۔ سرکا یہ لباس بڑا طرحدار ہے۔ چونکہ اس سے قدو قامت میں خوشگوار اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس کے سر پہ پگڑی بندھوا کر بہت خوش ہوتے تھے اور خوشی میں اس کو انعام دیا کرتے تھے۔

اگر غور کیا جائے تو جسم کی لاغری کا یہ احساس ہی ان کی مضبوطی اور پُروجاہت زندگی کی سب سے بڑی قوت تھی۔ اُن کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور بولنے

سوچنے میں یہ قوت ہر وقت کارفرما رہتی۔

محمد حنیف آزاد کا بیان ہے کہ:-

"قائدِ اعظم کی خوراک بہت ہی قلیل تھی۔ وہ اتنا کم کھاتے تھے کہ مجھے بعض اوقات تعجّب ہوتا تھا کہ وہ جیتے کس طرح ہیں۔ اگر مجھے اس خوراک پر رکھا جاتا تو یقیناً دوسرے ہی روز چربی پگھلنے لگتی۔ لیکن اس کے برعکس ہر روز چار پانچ مرغیاں، باورچی خانہ میں ذبح ہوتی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک چوزے کی یخنی اور وہ بھی بمشکل ایک چھوٹی پیالی ان کی خوراک کا جزو بنتی۔ فروٹ ہر روز آتا تھا اور کافی مقدار میں آتا۔ مگر یہ سب ملازموں کے پیٹ میں جاتا تھا۔

چشم پوشی "ہر روز رات کے کھانے کے بعد صاحب کاغذ پر اشیائے خوردنی کی فہرست پر نشان لگا دیتے تھے اور ایک سَو کا نوٹ میرے حوالے کر دیتے تھے۔ یہ دوسرے روز کے طعام کے اخراجات کے لئے ہوتا تھا۔

قائدِ اعظم کبھی حساب طلب نہیں فرماتے تھے جو باقی بچتا وہ سب ملازموں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ کبھی تیس بچ جاتے تھے۔ کبھی چالیس اور کبھی ساٹھ ستّر، ان کو یقیناً اس بات کا علم تھا کہ ہم ہر روز بہت سے روپے گول کرتے ہیں۔ مگر اس کا ذکر انھوں نے کبھی نہ کیا۔ البتہ مس جناح بہت تیز تھیں۔ اکثر بگڑ جاتی تھیں کہ ہم سب چور ہیں۔ ایک آنے کی چیز کا ایک روپیہ لگاتے ہیں مگر صاحب کا سلوک کچھ ایسا تھا۔ کہ ہم سب ان کے مال کو اپنا مال سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کی جھڑکیاں اور گھُرکیاں سن کر اپنے کان سمیٹ لیتے تھے۔ صاحب ایسے موقعوں پر اپنی ہمشیرہ سے کہتے: اِٹ از آل رائٹ۔ اِٹ از آل رائٹ،، اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔" (نقوشِ قائدِ اعظم)

خانگی زندگی

مذہب کی دیوار بمبئی کے لکھ پتی پارسی صنعت کار سر ڈنشا پینیٹ کے ہاں قائدِ اعظم کا آنا جانا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی ذہین اور ظریف اکلوتی لڑکی مس رتن بائی، عرف مس رتی آپ کے ہمراہ سیر و تفریح کے لئے گھوڑے پر نکل جاتی وہ "بمبئی کا گلاب" مشہور تھی۔ قائدِ اعظم خود بھی سدا بہار گلاب تھے۔ اس گلابی خصلت نے ان دونوں کو رشتۂ ازدواج میں پرو نا چاہا۔ مگر مذہب کی دیوار ان کے درمیان حائل ہو گئی۔ مس رتی کو والدین نے ایک مسلمان سے شادی کرنے سے بہت روکا مگر وہ اپنے انتخاب پر مُصر رہی۔ اِدھر قائدِ اعظم نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر رتن بائی نے بمبئی کے ایک ممتاز خطیب کے روبرو ایک پروقار تقریب میں اسلام قبول کر لیا۔ مغائرت کی دیوار ہٹنے پر دونوں کی حسبِ احکام شرع محمدی نکاح و شادی ہو گئی۔ جس کی معروف اخبار "سٹیٹسمین" نے ۱۹ راپریل ۱۹۱۸ء کو ان الفاظ میں خبر شائع کی :-

> "سر ڈنشا پینیٹ کی اکلوتی صاحب زادی مس رتن بائی نے کل اسلام قبول کر لیا اور آج آنریبل ایم اے جناح سے ان کی شادی ہو رہی ہے"

اس کے علاوہ یہ خبر ٹائمز آف انڈیا، سول ملٹری گزٹ اور دوسرے سرکردہ انگریزی اور اردو روز ناموں میں بھی جلی حروف میں شائع ہوئی۔

قائدِ اعظم چاہتے تو رتن بائی سے سول میرج کر سکتے تھے۔ لیکن آپ کی اسلام دوستی اور غیرت نے یہ بات برداشت نہ کی کہ وہ ایک غیر مسلمہ سے شادی کریں۔ مگر مخالفین نے اسے بھی ان کی کفریات میں شامل کر لیا کہ قائدِ اعظم نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کی تھی۔

قطع تعلق ۱۵؍ اگست ۱۹۱۹ء کو قائدِ اعظم کی اکلوتی بیٹی دینا پیدا ہوئی۔ اس کے بعد دینا کی والدہ فوت ہوگئی۔ قائدِ اعظم نے پھر شادی نہ کی اور دینا کو اس کی پارسی نانی نے بغرضِ پرورش سنبھال لیا۔ اس کے جوان ہونے پر قائدِ اعظم اس کی شادی کسی مسلمان نوجوان سے کرنے کے خواہاں تھے مگر دینا کی نانی اُسے ایک پارسی نوجوان سے بیاہنے پر مصر تھی اور لڑکی بھی اس کی طرف مائل تھی۔

قائدِ اعظم نے مولانا شوکت علی کو لڑکی کے پاس بھیجا کہ وہ اسے اسلامی تقاضوں سے آگاہ کریں اور اسے اپنے ارادہ سے باز رکھیں مگر نانی نے ایک نہ چلنے دی اور اپنی نواسی کی شادی اس پارسی نوجوان سے کر دی۔

قائدِ اعظم نے شفقتِ پدری کو بالائے طاق رکھ کر اس کے خلافِ شرع اقدام پر ہمیشہ کے لئے اپنی اکلوتی بیٹی سے تعلق قطع کر لیا اور اس کے بعد عمر بھر اس کی شکل تک نہ دیکھی اور سینہ پر صبر کا بھاری پتھر رکھ لیا۔ بعدازاں جب آپ کی بیٹی کا عقد ہوا تو آپ نے اس کا منہ تک دیکھنا گوارا نہ کیا اور نہ اس کی برات پر اپنا سایہ پڑنے دیا اور ایک دینی یا اسلامی تقاضے پر اپنی اکلوتی بیٹی کی شفقت و محبت کو قربان کر دیا۔ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ناموافقت دو مختلف الخیال، مختلف المزاج انسانوں کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم ہونا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ مگر اسے صبر و استقلال کے ساتھ تازیست نبھانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ قائدِ اعظم کے شباب کی توانائیاں اور رعنائیاں تو قوم کے کام آچکی تھیں عمرِ عزیز کی چالیس بہاریں بیت چکی تھیں کہ ۴۱ سال کی عمر میں آپ کو ایک نوخیز دوشیزہ نے اپنا رفیقِ حیات بنا لیا، انتخاب عظیم تھا۔ مگر مزاج عظیم نہ پایا تھا، عمر کے تفاوت نے مزاج میں تفاوت پیدا کر دیا اور جوانی کے تقاضوں نے دو ایسے بنیادی اختلافات پیدا کر دیئے جو ختم ہونے میں نہ آسکے۔ کیونکہ قائدِ اعظم خلوت پسند تھے اور رتن بائی جلوت پسند۔ قائدِ اعظم

کفایت شعار تھے مگر محترمہ شاہ خرچ تھیں، گو وہ بڑی خوبرو، خندہ رو اور زیرک تھیں۔ مگر مزاج میں قائدِ اعظم سے مطابقت پیدا نہ کر سکیں۔ قائدِ اعظم کے ایک دوست نے یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ قائدِ اعظم نے ازراہِ شرافت اس کی ذمہ داری اپنی رفیقۂ حیات پر نہ ڈالی اور بات صاف کر دی کہ :۔

"ہمارے گزارہ کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم آپس میں مطابقت پیدا کریں لیکن یہ ہم دونوں میں سے کسی کے بس کی بات نہیں۔"

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۲۶ء میں رتن بائی میکے چلی گئی جہاں وہ بیمار ہو گئیں اور ایک سال بعد تضاد کی اس دنیا ہی کو خیرباد کہہ کر سوئے عدم سدھار گئیں اور قائدِ اعظم کی زندگی ایک بار پھر بے کیف، اداس اور مایوسی کا شکار ہو گئی۔

آخری سہارا زندگی کی آرزوؤں کے جب تمام نگینے چکنا چور ہو گئے تو آپ کی زندگی کا واحد اور آخری سہارا اور اجالا آپ کی ہمشیرہ محترمہ مس جناح رہ گئیں۔ مسٹر اصفہانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ :۔

"بھائی کے پاس آکر مس جناح نے خود گھریلو انتظام سنبھالا، اس فرشتہ سیرت بہن نے بھائی کو گھریلو مصروفیات سے بالکل بے نیاز کر دیا۔ وہ ایک شفیق بہن کی حیثیت سے ان کی ایسی دیکھ بھال کرتیں جو عام ماؤں کے بس کی بات نہیں ہے کھانے پینے ٹہلنے، پڑھنے، لوگوں سے ملنے جلنے۔ غرض کہ قائدِ اعظم کے معمولاتِ زندگی کا ایسا نظام الاوقات انہوں نے ترتیب دیا تھا۔ جس کی پابندی سے بعض اوقات بھائی محمد علی جناح بھی تکمیل کی سختی پر بہت ہی نرم الفاظ میں احتجاج کرتے تھے، لیکن مس فاطمہ جناح کی زندگی کا مطلوب و مقصود ہی بھائی کی صحت اور ان کے مشن کی کامیابی تھا۔ وہ محترم بھائی کو حتی الامکان نظام الاوقات کی پابندی سے انحراف نہیں کرنے دیتی تھیں۔"

اسی لئے قائدِ اعظم اپنی ہمشیرہ محترمہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ :۔

" جب میں گھر واپس آتا تو میری بہن، میرے لئے امید کی کرن اور مستقل روشنی بن جاتی، میں پریشانیوں میں گھرا رہتا اور میری صحت خراب ہوتی جاتی لیکن فاطمہ کے حسنِ تدبیر اور توجہ سے میری تمام پریشانیاں دور ہوجاتیں "۔
(اُردو ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۶ء)

آغا حسین شاہ لکھتے ہیں کہ :۔
" اگر فاطمہ جناح قائدِ اعظم کی رفیق کار نہ ہوتیں تو شاید قائدِ اعظم بہت عرصہ پہلے خراب صحت، مسلسل بیماری اور تحریکِ پاکستان کی ہنگامہ خیز سیاسی جنگ کے کٹھن مراحل سے چل بسے ہوتے اور پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا "۔ (ایضاً)

ڈاکٹر ریاض علی شاہ لکھتے ہیں کہ :۔
" محترمہ فاطمہ جناح اپنے محبوب بھائی کی تیمار داری میں بڑی دلچسپی لیتی تھیں۔ وہ کئی کئی راتیں اور دن جاگ کر گزار دیتی تھیں اور دن رات پورے انہماک سے قائدِ اعظم کی تیمارداری میں مصروف رہتیں، انہوں نے اپنی پسند، اپنا چین و آرام سب کچھ بھائی کے لئے وقف کر رکھا تھا "۔ (بشرح صدر)

یہ نازک مزاج رتن بائی کے بس کی باتیں اور کاوشیں نہ تھیں۔ اسی لئے مولا کریم نے انہیں جلد واپس بلا لیا اور محترمہ فاطمہ جناح کو آپ کی خدمت کے لئے وقف کردیا۔ جنہوں نے اپنی تمام عمر اپنے عظیم بھائی پر نچھاور کردی۔

پوشاک و خوراک قائدِ اعظم بچپن ہی سے خوش پوش تھے، کھیل کود کے شوقین ہونے کے باوجود آپ کوئی ایسا کھیل کھیلنا پسند نہ کرتے تھے جس سے کپڑوں کے میلا ہونے کا امکان ہوتا۔ دلوں کو موہ لینے والا یہ عظیم انسان ہمیشہ بے عیب اور نفیس کپڑا پہنتا۔ دیسی بدیسی ہر قسم کا لباس بلا تکلف استعمال کرتا۔ رفتہ رفتہ آپ کا نفیس، دیدہ زیب۔ بے داغ بے شکن لباس اور ایک شیشہ عینک آپکا امتیازی نشان بن گیا جو تا دمِ آخر قائم رہا۔

لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ چیمسفورڈ وغیرہ سب اس امر پر متفق اللسان تھے کہ :-
" انہوں نے متحدہ ہندوستان میں ان جیسا جامہ زیب اور نفاست پسند
اور کوئی شخص نہیں دیکھا "۔
ہر وقت خوش رہنا، آپ کا معمول رہا ۔

آپ نے چونکہ لندن میں تعلیم پائی تھی ۔ اس لئے نفاست طبع میں آپ منفرد مقام رکھتے تھے ۔ بدوران تعلیم آپ اعلیٰ قسم کا انگریزی لباس پہنتے تھے ، نفاست اور جامہ زیبی سے آپ کو شروع سے لگاؤ تھا ۔ وکالت کے زمانہ میں بھی دیدہ زیب سوٹ زیب تن کرتے تھے ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت کے دوران ایک عرصہ تک اسی لباس میں ملبوس رہے ۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد توانا مسلم لیگ کا جو پہلا عظیم الشان تاریخی اجلاس ۱۵ تا ۱۸ اکتوبر لکھنؤ میں ہوا ۔ اس میں پہلی مرتبہ قائداعظم ٹوپی اور شیروانی پہن کر تشریف لائے ، جس پر لوگوں نے دل کھول کر تحسین و آفرین کے پھول برسائے ۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخ ساز اجلاس میں آپ سفید چوڑی دار پاجامہ ، سیاہ شیروانی اور سیاہ ٹوپی زیب تن کر کے آئے اور قیام پاکستان تک آپ یہی لباس استعمال کرتے رہے ۔ یہ ٹوپی جناح کیپ کے نام سے مشہور ہوئی اور قیام پاکستان کے بعد بھی چوڑی دار پاجامہ یا شلوار ، ٹوپی اور شیروانی آپ کا سرکاری لباس رہا ۔ جو بہت جلد ایک ملکی اور قومی لباس کی حیثیت اختیار کر گیا ۔ آخیر عمر میں آپ نے غیر ملکی کپڑا پہننا ترک کر دیا اور دیسی کھڈیوں کا کپڑا بھی استعمال کرتے رہے ۔

قائداعظم کی بود و باش انگریزی طرز کی تھی ، کھانا بھی مغربی طرز کا کھاتے تھے ۔ مگر دیسی کھانے آپ کو زیادہ پسند تھے ۔ اسی لئے آپ کے دسترخوان پر زیادہ تر دیسی کھانے چنے جاتے تھے ۔ آپ نے باورچی خانے میں دو باورچی رکھے ہوئے تھے ۔ ایک ہندوستانی کھانے پکانے کے لئے اور دوسرا ولایتی کھانے تیار کرنے کے لئے ۔ چونکہ دیسی کھانے زیادہ

پکتے تھے اس لئے ولایتی کھانے پکانے والا باورچی اکثر بے کار رہتا تھا۔

آپ دونوں وقت چوزے کے شوربے کی ایک پیالی لیتے تھے، کھانوں میں کباب، پھلوں میں آم، جوس میں نارنگی اور میٹھے زیادہ پسند کرتے تھے۔ کم مرچوں والے پاپڑ بھی شوق سے کھاتے تھے۔ چائے ہلکی اور کافی تیز رنگ کی استعمال کرتے تھے۔ سکون کے لمحات میں سگار اور کام کے اوقات میں سگریٹ پینے کے عادی تھے۔ کبھی کبھی پان بھی استعمال کر لیتے تھے۔ آپ کو کارنیشن اور گلاب سے عشق تھا۔ مگر اپنے کوٹ کے کالر میں کبھی پھول نہ لگاتے تھے۔

آپ کو عام لیڈروں کی طرح دوسروں کے گھروں میں ٹھہرنے یا دعوتیں کھانے کا شوق نہ تھا۔ کیونکہ آپ نمود و نمائش کے عادی نہ تھے، کھانے پینے کے معاملہ میں نظم و ضبط برتتے جب کسی چیز کی مقدار استعمال مقرر کر دیتے۔ پھر اس سے زیادہ قطعاً استعمال نہ کرتے۔

زبان و بیان | قائداعظم کی مادری زبان گجراتی تھی۔ آپ ابھی چھ سال کے تھے کہ آپ کو گھر پر گجراتی کی تعلیم دینے کے لئے ایک استاد مقرر کیا گیا۔ کیونکہ آپ کے والدین کے خیال میں آپ کی عمر سکول جانے کی متحمل نہ تھی جو گھر سے خاصا دور تھا اور پیدل آنا جانا پڑتا تھا۔ جب آپ ۹ سال کے ہوئے تب آپ کو پرائمری سکول میں داخل کرا یا گیا۔

اردو سے آپ کو بڑی محبت تھی، اگرچہ شروع میں آپ کو اردو بولتے دقت ہوتی تھی مگر بعد میں روانی سے بولنے لگ گئے تھے۔ حتیٰ الوسع آپ قومی زبان میں بات کرنے کے لئے اردو بولنے کو ترجیح دیتے۔ اس بارہ میں نواب بہادر یار جنگ، نواب زادہ لیاقت علی خان اور سیّد مطلوب الحسن کو خاص طور پر ہدایت تھی کہ میں جہاں بھی غلطی کروں مجھے روک دیا جائے کبھی کبھی یہ فریضہ آپ کے ملازم بھی ادا کر دیتے جس پر آپ ان کا شکریہ ادا کرتے تھے۔

جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق تھا آپ اہلِ زبان معلوم ہوتے تھے۔ آپ کی انگریزی گفتگو پر تو خود انگریز انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ اسی لئے لارڈ مونٹ بیٹن نے بی۔ بی سی کے نمائندہ کو قائداعظم کے بارے میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"نہرو اور گاندھی بھی انگریزی میں اچھے تھے۔ مگر جس روانی کے ساتھ جناح انگریزی زبان پر حاوی تھے وہ اس کے عشر عشیر بھی نہ تھے۔ انگریزی میری مادری زبان تھی اس کی مادری زبان نہ تھی لیکن میں اُسے اس کے مقام سے ذرا بھی نہ سرکا سکا"۔ (نوائے وقت ۲۷ فروری ۱۹۷۶ء)

جہاں تک حسن بیان کا تعلق ہے۔ وہ بڑا مدلل مگر مختصر ہوتا تھا۔ بقول جی الانہ :-

"آپ کے موثر ترین ہتھیار، مدلل اندازِ بیان، روانی اور شعلہ بیانی، تدبر اور دلوں میں اتر جانے والے الفاظ تھے جو لوگ عام جلسوں میں ان کی تقریر سنتے بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھتے ...... جناح ڈھکے چھپے الفاظ میں کچھ کہنے سُننے کے عادی نہ تھے بلکہ بے خوفی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور کسی ماہر فن جراح کی طرح ہر ایک مسئلہ کے رگ و ریشے کو ٹٹولتے"۔

(قائدِ اعظم جناح)

سروجنی نائیڈو قائدِ اعظم کے بارے میں اپنی کتاب "ایمبیسڈر آف ہندو مسلم یونٹی" صہ۲ پر لکھتی ہیں کہ :-

"دراز قد، شاہانہ انداز اور عادتوں کے مالک محمد علی جناح، غیر معمولی جرأت و ہمت اور تحمل کے انسان ہیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں ان کا صبر و سکون اور لوگوں سے بے تعلقی ان کے شناساؤں کے نزدیک ایک نقاب ہے۔ ان کے ملنے جلنے والے بخوبی واقف ہیں کہ وہ انتہائی مخلص اور ملنسار فرد ہیں۔ ان کا دل انسانیت کے جذبہ سے پُر ہے، کوئی عورت بھی ان کی طرح نرم دل نہ ہوگی۔ جب وہ بات چیت کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے منہ سے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی ہر بات انتہائی معقول اور شائستہ ہوتی ہے۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ جانے والے انسان نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی شخصیت کو پردے میں چھپا رکھا ہے۔ اس سے جھانک کر دیکھا جائے تو وہ انسانِ کامل کے درجہ پر فائز ہیں"۔

نواب صدیق علی خان اپنی کتاب "بے تیغ سپاہی" میں آپ کے اندازِ بیان وغیرہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:-

"اس کے الفاظ میں پہاڑوں کا استقلال۔ اس کے لہجے میں گہرے دریا کا سکون۔ اس کے اندازِ فکر میں آسمانوں کی بلندی، اس کی آواز میں خلوص اور سچائی کے نغمے پھوٹ رہے ہوتے تھے۔ وہ باوجود منحنی بدن ہونے کے ایک پُرشکوہ اور بارعب انسان تھے۔ ان کے چہرے پر جلال برستا تھا۔ ان کی منفرد شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ جو ایک دفعہ ان کے دائرہ اثر میں آگیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے ان کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ وہ علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھے ؎

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم، پاک دل و پاک باز

اسی لئے گول میز کانفرنس کے موقع پر قائدِ اعظم کی تگ و دو دیکھ کر لیڈی لارڈ ریڈنگ (وائسرائے) نے کہا تھا کہ:-

"حصولِ مقصد کے لئے مسٹر جناح کو میں نے چیتے کی طرح تلاش و جستجو میں گھومتے دیکھا"۔ (عہد مونٹ بیٹن صد ۳۰۵)

جذبۂ انسانیت انسان کامل وہی ہوسکتا ہے۔ جو تمام خصوصیاتِ بشری کا حامل ہو۔ بفضلہ تعالٰے قائدِ اعظم تمام بشری خصوصیت کے مظہر تھے۔ اسی لئے انگریز صحافی اور مصنف بیورلی نکلس نے قائدِ اعظم کو فوق البشر قرار دیا اور بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے لکھا کہ:-

"قائدِ اعظم انسانِ کامل کے درجہ پر فائز ہیں۔ ان کا دل انسانیت کے جذبہ سے پُر ہے۔ کوئی عورت بھی ان کی طرح نرم دل نہ ہوگی"۔

قائدِ اعظم واقعی بڑے صاحب درد اور رقیق القلب انسان تھے۔ ان سے کسی

کا دکھ درد نہیں دیکھا جاتا تھا۔ کانٹا چبھے اور اس کی تکلیف کا اظہار نہ ہو یہ تو ممکن ہے مگر اس کا طبعی اثر نہ ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ سیاست کے خارزار میں قائدِاعظم کو ایسے تیر ونشتر بھی جھیلنے پڑے جن کی وجہ سے بسا اوقات قلبی کیفیات کی کہانی آنسوؤں کی زبانی معلوم ہو جاتی تھی۔ قلب کے نالے جب آنکھوں کے راستے بہہ اٹھتے تو اس وقت آپ کی گرانی طبع دور ہو جاتی اور آپ زمانہ کی تلخیوں کو بھلا کر امن وسکون پاتے۔

رازداری قائدِاعظم کو زندگی میں مسرت و انبساط کے لمحات بہت کم نصیب ہوتے ساری عمر دکھ درد، رنج وغم، فکر و الم نے آپ کا محاصرہ کئے رکھا۔ ازدواجی سلسلوں کا جلد منقطع ہو جانا۔ اکلوتی اولاد کا زندگی بھر کے لئے ناسور بن جانا۔ ہر وقت ملک و ملّت کے غم اور فکر میں غلطاں و پیچاں رہنا۔ مخالفین و معاندین کے تیز و تند حملوں کا تن تنہا مقابلہ کرتے رہنا ایسے فکری سرطان تھے۔ جنہوں نے قائدِاعظم کو آہستہ آہستہ تپِ دق کے موذی مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ بظاہر آپ قوم کے مسیحا و ناخدا تھے۔ بباطن خود شدید مریض تھے۔ مگر ملک و قوم کی خاطر اپنا مرض اور دردِ دل کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے اور اس طرح خاموشی سے اپنے روزمرّہ کے معمولات میں مگن رہتے تھے کہ دیکھنے والے آپ کی بیماری کا شبہ تک بھی نہ کر سکتے تھے۔ بیماری کے تمام عرصہ میں آپ نے ایک دِن تو کیا، ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے معمولات ترک نہ کئے۔ اور نہ اس معاملہ میں ڈاکٹروں کے مشوروں اور اپنی بہن کے تقاضوں کو درخورِ اعتنا سمجھا اور آخیر دم تک کام کے ساتھ ساتھ اس موذی مرض کا بھی مقابلہ کرتے رہے۔

آپ کی وفات کے بعد جب آپ کے عیّار و مکّار دشمنوں کو آپ کی بیماری کا علم ہوا تو وہ سر پیٹ کر رہ گئے اور کہنے لگے کہ :-

" اگر ہمیں یہ علم ہو جاتا کہ قائدِاعظم تپِ دق میں مبتلا ہیں تو ہم پاکستان کا مطالبہ جلد تسلیم نہ کرتے بلکہ اسے طول دیتے تا آنکہ وہ یہاں سے رخصت ہو جاتے اور پاکستان یہیں کاغذوں میں پڑا اور دھرا رہ جاتا۔"

مگر قدرت کو چونکہ پاکستان کا تاج قائدِ اعظم کے سر پر رکھنا تھا۔ اس لئے اس نے بیماری کا راز فاش نہ ہونے دیا اور پاکستان کے دشمن ہاتھ ملتے رہ گئے۔

کوہ پیکر قائدِ اعظم نے اپنی بیماری کو اتنی چابکدستی سے چھپائے اور دبائے رکھا کہ دشمن تو دشمن اپنوں پر بھی یہ راز افشا نہ ہونے دیا۔ اور نہ کبھی چہرہ کے تاثرات نے ان کی چغلی کھائی۔ البتہ کبھی کبھی درد کا لاوا آنکھوں سے ضرور پھوٹ پڑتا۔ مگر دیکھنے والے انہیں کوئی اہمیت نہ دیتے۔ کیونکہ آپ کے غم زدہ باطن کے مقابلہ میں آپ کا صحت مند ظاہر بڑا خوش کن تھا۔

آپ پہلی دفعہ ملک و قوم کے غم میں اس وقت آبدیدہ ہوئے۔ جب آپ کی سولہ سالہ ہندو مسلم اتحاد کی مساعی جمیلہ پر پنڈت موتی لعل نہرو اور ان کے حواریوں نے پانی پھیر دیا اور مسلمانوں کے جائز مطالبات اپنی اکثریت کے زعم میں تسلیم کرنے سے انکار کر کے نہرو رپورٹ منظور کر لی۔ جس پر آپ نے بچشمِ تر یہ اعلان فرمایا جو آپ کے قلبی طوفان کی غمازی کر رہا تھا کہ :-

"اب ہمارے تمہارے راستے جُدا جُدا ہیں"۔

اس دن سے آپ نے ہندو مسلم اتحاد کی بجائے اتحاد بین المسلمین کی مہم شروع کر دی۔

عزت و عظمت

محبوبیت و مقبولیت قائدِ اعظم کو عوام و خواص میں جو محبوبیت و مقبولیت نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے لیڈر کے حصہ میں نہ آئی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران آپ جہاں بھی گئے۔ ہزاروں مسلمان آپ کی تقریر سننے کے لئے جوق در جوق جمع ہو گئے۔ جہاں بھی پہنچے آپ کا فلک شگاف نعروں سے استقبال کیا گیا۔ آپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر مسلمانوں نے آپ کی زندگی میں اور بعدازاں آپ پر تشکر و امتنان کے اتنے پھول برسائے جو کسی عوامی لیڈر کو نصیب نہ ہوئے۔

آپ جو فرماتے مسلمان اسے پتھر کی لکیر سمجھتے اور فوراً اس پر عمل شروع کر دیتے جس کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے باآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ قائدِ اعظم نے جب مولانا آزاد کو کانگرسی شو بوائے قرار دیتے ہوئے ان سے فرمایا کہ :-

> "کیا آپ کو یہ احساس ہے کہ کانگرس نے محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ایک قومی تنظیم ہے۔ آپ کو اپنا صدر بنایا ہے۔ تاکہ وہ دوسرے ملکوں کو دھوکا دے سکے۔ آپ نہ ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ مسلمانوں کی، کانگرس ایک ہندو جماعت ہے۔ اگر آپ میں ذرا سی بھی خودداری ہے تو مستعفی ہو جائیے۔" (قائدِ اعظم جناح صد ۲۹۲)

مولانا آزاد تو کیا مستعفی ہوتے ان کے شہر :-

> "کلکتہ کے لوگوں نے ان کے خلاف اپنی ناراضی اور غم و غصے کا اظہار کرنے کے لئے انہیں عیدین کی نماز کی امامت سے الگ کر دیا۔"
> (فائنل فیز آف اسٹرگل فار پاکستان)

محبّت و عقیدت | قائدِ اعظم کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے قلبی تعلق تھا۔ اس لئے آپ اکثر وہاں جاتے اور اس کے طلبار کو اپنے خیالاتِ عالیہ سے نوازتے۔ طلبار کے دل میں بھی آپ کے لئے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ نوابزادہ محمود علی لکھتے ہیں:-

"۷ر نومبر ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ جب قائدِ اعظم علی گڑھ تشریف لائے ریلوے اسٹیشن پر ان کا جس شان سے استقبال کیا گیا۔ وہ کسی حکمران کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر اسٹیشن پر اُمڈ آیا ہے۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ریلوے اسٹیشن کی فضا نعرۂ تکبیر اور قائدِ اعظم زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی، شاعرانہ اصطلاح کے مطابق فلک میں شگاف پڑے جا رہے تھے۔ ہر طرف سبز پرچم لہرا رہے تھے اور ان کے سائے میں قائدِ اعظم خراماں خراماں اسٹیشن سے باہر آرہے تھے جب وہ اس بگھی میں سوار ہوئے جو خاص ان کی سواری کے لئے لائی گئی تھی تو طلبار کے جوشِ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے بگھی کے گھوڑے کھول دیئے اور اسے خود کھینچتے ہوئے۔ قائدِ اعظم کی قیام گاہ تک لے گئے، یونیورسٹی ایڈنگ اسکول کا ایک چاک و چوبند دستہ ان کے جلو میں تھا۔

شام کو اسٹریچی ہال میں جلسہ منعقد ہوا۔ ہال میں انسانی سروں کا ایک سمندر تھا۔ جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔"

دِل کی بات | مسلمان زعمار میں بڑے بڑے مقرّر اور خطیب موجود تھے، مگر حق تعالیٰ نے جو اثر و تاثیر قائدِ اعظم کی زبان کو بخشی تھی۔ وہ کسی اور کے حصّہ میں نہ آئی۔ آپ اپنے زورِ خطابت، دلکش طرزِ بیان اور دلنشین باتوں سے مسلمانوں کے اس طرح دل موہ لیتے کہ وہ فی الفور یہ محسوس کرنے لگتے کہ یہ شخص تو ہمارے دل ہی کی بات کہہ رہا ہے۔

اس کی تائید خود قائدِ اعظم کے مندرجہ ذیل ارشاد سے ہوتی ہے۔ آپ نے

۲۵ دسمبر ۱۹۴۲ء کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"ہندوستان کے مسلمان مجھ سے اس قدر محبت و الفت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں نے وہی کچھ علی الاعلان کہا ہے جو کروڑوں مسلمانوں کے دل میں تھا"

اسی چیز نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا اور مسلمانوں نے قائداعظم کو اپنی غیر متزلزل وفاداری اور حمایت کا یقین دلایا۔ بچے بچے کی زبان پر قائداعظم محمد علی جناح کا نام آیا۔ لاکھوں مسلمانوں نے اپنے مکانوں اور دکانوں میں آپ کی تصاویر آویزاں کر کے اپنے اس عظیم قائد سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا۔ شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں، کارخانوں میں، کھیتوں میں، سکولوں اور کالجوں میں، گلیوں اور بازاروں میں قائداعظم ہی کے عظیم کارناموں کے چرچے تھے۔ پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ کیونکہ اب مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ برس ہا برس کی تکالیف، آلام و مصائب اور ظلم و ستم کا مداوا صرف اور صرف پاکستان کے قیام میں ہے جو قائداعظم لئے بغیر پیچھے نہ ہٹیں گے۔ حالانکہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ ہندوؤں نے انگریز کے مسلمانوں کے تعاون سے ایسے سنگین حالات پیدا کر دیئے تھے کہ پاکستان کا حصول ناممکن نظر آرہا تھا۔ مگر قائداعظم نے بڑی ہمت و جرأت اور پامردی سے مشکلات خطرات اور مزاحمتوں پر قابو پا کر اپنی علالت اور ضعیف العمری کے زمانے میں مسلمانوں کو پاکستان لے کر دیا۔ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنتا تو پھر ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔

مقناطیسی شخصیت

مسٹر ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی لکھتے ہیں کہ :-

"قائداعظم کی ذات نظم و ضبط کا نمونہ تھی۔ وہ ڈسپلن کو زندگی میں بہت اہمیت دیتے تھے۔ کیونکہ اس کے بغیر منظم معاشرے کا قیام ممکن نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے تنظیم کی تبلیغ کی۔ وہ عام جلسوں میں بھی نظم و ضبط برقرار رکھنے کی ہدایت

کرتے تھے۔ حالانکہ ان تمام جلسوں میں موجودہ عوام اپنے محبوب رہنما کی ایک جھلک دیکھنے اور اپنے قائد کی باتیں سننے کے لئے جمع ہوتے تھے اور ایسے اجتماعات میں جذبات پر قابو پانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ لیکن قائدِ اعظم ان عام جلسوں میں بھی زبردست ڈسپلن قائم رکھتے۔ جہاں مجمع قابو سے باہر ہوا۔ وہ مائیکروفون پہ آئے اور اپنی انگشتِ شہادت بلند کی جس کے بلند ہوتے ہی مجمع خاموش ہو جاتا۔ یہ ان کی مقناطیسی شخصیت کے سحر کا اثر تھا۔"

یہ قائدِ اعظم کی سحر انگیز شخصیت کی کرامت تھی کہ آپ نے دس کروڑ اسلامیانِ ہند میں نظم و ضبط پیدا کیا۔ یہ اُسی نظم و ضبط کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں اور انگریزوں کو ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہاتھ جوڑنے پڑے کہ خدارا یہ لو پاکستان اور ہمارے لئے دردِ سر نہ بنو۔

مسحور کن شخصیت | وائسرائے کا مشیر مسٹر ہڈسن لکھتا ہے کہ :-

"جناح کوئی ہندوستانی زبان روانی سے نہ بول سکتا تھا۔ عام طور پہ اظہارِ خیال کے لئے انگریزی زبان کا سہارا لیتا تھا۔ عادات و خصائل، رہن سہن وضع قطع اور بول چال میں عوام سے اتنی دور رہتے ہوئے جناح کی بے پناہ مقبولیت ایک محیّر العقول کرشمہ ہے۔

خلوت پسندی اور تدبّر کی یکتائی کے علاوہ جناح کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی بڑا حیران کن ہے اور وہ یہ کہ جناح کوئی عام سیاسی کارکن نہ تھا وہ کانگرس میں ایک واجب التکریم رہنما تھا۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں آزادی پسند نوجوانوں کو اس سے پرستش کی حد تک عقیدت تھی ..... حالانکہ جناح دانش ورانہ رہنمائی میں یقین رکھتا تھا۔ وہ عوام کے پیچھے چلنے کی بجائے انہیں اپنے پیچھے چلانے کا قائل تھا .....

وہ اپنے ملاقاتیوں یا سامعین جلسہ پر نظریں گاڑکر جانے کیا طلسم پڑھتا تھا

کہ لوگ فریفتہ ہو جاتے۔ اس کا کردار منفرد اور اس کی شخصیت سب سے پُر اسرار اور مسحور کن ہے۔"

دنیا انگریزوں کی طاقت کا لوہا مانتی تھی۔ ان کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ لیکن جب قائداعظم نے ان کو ہندوستان سے بھگایا تو پھر ان کے قدم کہیں بھی نہ جم سکے۔ انہیں یکے بعد دیگرے قریباً قریباً ہر ملک سے اپنا بوریہ بستر سمیٹنا پڑا اور انگلستان کے چھوٹے سے جزیرہ میں واپس جا کر دم لینا پڑا۔ یہاں تک کہ یورپ نے بھی ان کو اپنی مشترکہ برادری سے خارج کر دیا۔

قائداعظم نے انگریزوں سے اپنی طاقت کا لوہا اس انداز سے منوایا کہ دوسروں کی چیخیں نکلوانے والوں کی خود اپنی چیخیں نکل گئیں۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند لکھتے ہیں:۔

"جناح نوجوان، شائستہ، باوقار، دلائل کے ہتھیاروں سے مسلح اپنی سکیم کی برتری پر مصر اور بضد، اس سے کم پر وہ راضی ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پہلے ہی تھکا ہوا تھا۔ اس نوجوان نے مجھے بالکل زچ کر کے رکھ دیا۔ چیمسفورڈ وائسرائے نے اس سے بحث میں الجھنے کی کوشش کی، اس نوعمر سیاستدان نے غریب چیمسفورڈ کو اس طرح جکڑ کر رکھ دیا۔ جیسے مکڑی مکھی کو اپنے جالے میں جکڑ لیتی ہے۔ گاندھی اس کے مقابلہ میں بڑی غیر مؤثر شخصیت تھے۔"

(مسٹر مانٹیگو کی ڈائری)

جب تک کسی انسان کو انسان سے واسطہ نہ پڑے۔ اس کے ظاہر و باطن، معاملات و معاشرت کے متعلق نہ صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور نہ اس کی عکاسی کی جا سکتی ہے برٹش امپیریلزم کے خلاف جنگ لڑنے والے، اسلام کے اس مردِ مجاہد کی خوبیوں کا جتنا صحیح اندازہ اس کے مردِ مقابل برطانوی شاطر لارڈ مونٹ کو ہوا۔ کسی اور کو ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ تقسیم ہند کی کشتی فی الواقعہ ان ہی دو پہلوانوں کے درمیان لڑی جا رہی تھی۔ گاندھی اور نہرو کی حیثیت تو ثانوی تھی کیونکہ ان کی طرف سے خود لارڈ مونٹ بیٹن وکالت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ یہ کشتی ہارنے کے بعد بھی ہندوؤں کے گیت گاتا رہا۔ اور تقسیم ہند

کارو نارو تا رہا ۔

صاف گو سیاستدان | مگر بالآخر مونٹ بیٹن کو بی ۔ بی ۔ سی کے سامنے قائداعظم کی عظمت کا ان الفاظ میں اعتراف کرنا پڑا ۔

"جناح صاف گو اور راست باز قسم کا سیاست دان تھا ۔ اس کی شخصیت بڑی نمایاں اور ممتاز تھی ۔ پہاڑ کی طرح وہ اپنے مقام پر مستحکم اور سخت تھا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان تھا ۔ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ میں اس کے دلی خیالات کو بھانپ سکوں اور اس کے سینے کی گہرائیوں میں اتر سکوں ۔ وہ علم نفسیات کا ماہر اور نہایت عقل مند سیاستدان تھا ۔ ذہین و فطین ۔ انگریزی زبان پر کامل اور مکمل عبور رکھنے والا تھا ۔ وہ میرے دلائل کو بڑی آسانی سے سمجھ جاتا ۔ نہرو اور گاندھی بھی انگریزی میں اچھے تھے مگر جس روانی کے ساتھ جناح انگریزی زبان پر حاوی تھا ۔ وہ اس کے عشرِ عشیر بھی نہ تھے ۔ جناح میرے دلائل کو اچھی طرح سمجھ تو جاتا تھا ۔ لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے اس نے اپنے اور میرے درمیان کوئی پردہ لٹکا دیا ہو ۔ وہ میرے تمام براہین و دلائل کو منٹوں میں ایک طرف کر دیتا تھا اور ان کے جواب کے لئے اس کے دماغ میں تھوڑی سی تحریک پیدا کرنے میں بھی ناکام رہتا ۔ انگریزی میری مادری زبان تھی ۔ اس کی مادری زبان نہ تھی لیکن میں اسے اس کے مقام سے ذرا بھی سرکا نہیں سکا ۔"

(نوائے وقت ، ۲۷ فروری ۱۹۷۶ء)

اسے کہتے ہیں ـــــ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے ـــــ اس مردِ مجاہد نے تنِ تنہا انگریزوں اور ہندوؤں کو اپنے عزم بالجزم کے سامنے گھٹنے ٹیکنے اور مطالبہ پاکستان تسلیم کرنے پر جس طرح مجبور کیا ۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔

قائدِاعظم اور پاکستان کے مخالفین میں لارڈ مونٹ بیٹن سرِفہرست تھے۔ ان کا یہ اعتراف قائدِاعظم کی ذات وصفات، شخصیت و سیاست، عظمت و رفعت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر رہا ہے۔ انہوں نے حقائق کو چھپانے کی بڑی کوشش کی، مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے۔ کیونکہ حق کے اندر قدرت نے اتنی قوت رکھ دی ہے کہ وہ نہ چھپائے چھپ سکتا ہے نہ مٹائے مٹ سکتا ہے۔ اور زود یا بدیر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

باخدا ناخدا

بڑی مشکل سے پیدا اک وہ آدم زاد ہوتا ہے
جو خود آزاد جس کا ہر نفس آزاد ہوتا ہے

حق تعالیٰ نے کلام پاک میں کفار کی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ:۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ؕ
کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہانتک کہ اگر قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔ (بقرہ ۲۷/۲)

پاکستان بننے سے قبل اہلِ ہند کی اکثریت نے ایسے ہی حالات پیدا کر رکھے تھے مسلم اقلیت اور اس کے رہنماؤں کا بہ الفاظ اکبر الہ آبادی یہ حال تھا

اِدھر ہے قوم ضعیف و مسکین اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں

ہر شخص غرض کا بندہ بنا ہوا تھا۔ قریباً ہر رہنما کے پیش نظر قومی مفاد سے زیادہ ذاتی مفاد تھا۔ کسی فرد یا جماعت کے سامنے ایسا کوئی واضح پروگرام نہ تھا جس پر عمل پیرا ہو کر اقلیت کو جبر و استبداد سے بچایا جائے یا مسلمانوں کے دین و ایمان اور عزت و ناموس کی حفاظت کی جاسکے۔

طول و عرضِ ہند میں مسلمانوں پر اس بیدردی سے عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا کہ خالق سے اپنی اس مخلوق کی حالتِ زار نہ دیکھی گئی۔ اس کی رحمت و غیرت میں جوش آیا۔ اور اس نے اپنے کروڑوں نام لیواؤں کو غیر مسلموں کے رحم و کرم سے نجات دلانے کے لئے قومی خدمات کا بہترین ریکارڈ۔ سودیشی دِل و دماغ اور تمدن و معاشرت

رکھنے والے رہنماؤں کے مقابلہ میں ایک عافیت پسند۔ بدیشی تعلیم و تربیت اور تمدن و معاشر رکھنے والے امیر کبیر کو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے نجات دلانے کے لئے منتخب فرمایا۔ جو نہ عزت و شہرت کا بھوکا تھا اور نہ منصب و دولت کا۔

جب مولا پاک نے جہادِ پاکستان کی کمان اس نحیف و ناتوان بڈھے جرنیل کے ہاتھ میں دی تو اس نے اسے اس جہاد میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے لئے یہ غیبی امداد بخشی کہ اس کے نطق کو اثر و تاثیر دی۔ اسے خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا مجسمہ بنا دیا۔ اس کے عزم و ارادہ میں نو کروڑ مسلمانوں کی تاب و طاقت رکھ دی۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس کے لئے والہانہ عزت و عظمت اور عقیدت و محبت پیدا کر دی۔ مسلمانوں کے دشمنوں اور مخالفوں کے دلوں پر اس کا رعب اور ہیبت بٹھا دی۔ اس کی تائید و اعانت کے لئے حجروں اور خانقاہوں کے گوشہ نشین علمار ربانی اور مشائخ روحانی کی جماعت میدانِ عمل میں بھیج دی۔ بس پھر کیا تھا ؎

یک بیک بن کر حقیقت سامنے آ ہی گیا
جو خیال اُس کا زمانے کے لئے مبہم رہا

دربارِ نبوی میں دینی تربیت کے ساتھ ساتھ قائدِ اعظم کی روحانی تربیت جس "مردِ غازی" نے کی تھی۔ آخیر ایام میں قائدِ اعظم نے بسلسلہ جہادِ کشمیر اس مردِ غازی کو ایک خاص مشن پر دربارِ نبویؐ میں بھیجا۔ وہ اپنا زیادہ وقت دربارِ نبویؐ کے خادمِ خاص آغا اسحاق علی کے پاس گزارتے تھے جو زیرِ مزار مبارک آنے جانے کے واحد مجاز تھے۔ آغا صاحب نے اس "مردِ غازی" کو بتلایا کہ :-

"جس روز قائدِ اعظم کا پاکستان میں انتقال ہوا۔ اس روز مجھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپؐ بہت مسرور نظر آ رہے تھے، فرمایا کہ ——— آج ہمارا دوست آ رہا ہے۔ اس کی آمد کی خوشی مناؤ، جب دریافت کیا کہ حضور وہ کون ہیں ؟ تو فرمایا محمد علی جناح ! ——— چنانچہ

اس روز ہم نے شیرینی وغیرہ پکائی" (مشاہدات وواردات صہ ۱۴۹)

اس خواب کی تائید اس خواب سے ہوتی ہے۔ جو پاکستان بننے سے پہلے سرحد ہزارہ کے ایک معمر بزرگ نے جو قائداعظم کے نام و مقام تک سے ناواقف تھے۔ روضۂ اطہر کے متصل دیکھا کہ :-

"حضورؐ سرورِ دو عالم بہ نفسِ نفیس تشریف فرما ہیں اور آپ کے ساتھ شانہ بشانہ ایک لمبے معمر صاحب سر پر ٹوپی پہنے کھڑے ہیں اور پیچھے لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کسی نے حضورؐ سے پوچھا کہ حضورؐ یہ ٹوپی والے کون ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا :-

تم نہیں جانتے۔ یہ محمد علی جناح ہیں اور یہ لوگ سب کے سب مجاہد ہیں ——— پھر حضور نے اپنے دستِ مبارک سے آبِ زمزم کی بہت مقدار لیکر جناح اور اس کے ساتھیوں پر چھڑکی"۔

اس خواب کی پوری تفصیل ہزارہ کے محمد افضل خان بی اے کے قلم سے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۱۹ر جنوری ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔

ان کے علاوہ بھی کئی ثقہ حضرات نے قائداعظم کو دربارِ نبویؐ میں دیکھا۔ چونکہ عالمِ خواب میں حضورؐ کے سوا اور کوئی حضور کی شکل مبارک میں نہیں آسکتا۔ اس لئے رویائے صادقہ شک و شبہ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

زمرۂ اولیاء میں

اللہ جل شانہ کا فرمان ہے کہ ———

۱۔ مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کو پڑھکر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو رزق دیا۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ وہی سچے مومن ہیں"۔

(انفعال ۱/۹)

۱ ۔ "میں ان کے لئے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کر دیتا ہوں"
(مریم ۹۶)

۲ ۔ "اور ان کو ملک میں حکومت دیتا ہوں" (النور ۵۵)

۴ ۔ "میں ان کو دوست بنا لیتا ہوں" (جاثیہ ۱۹)

۵ ۔ "اور جو اللہ کے دوست بن جاتے ہیں ۔ ان کو نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے"

بفضلہ تعالے قائد اعظم کو عنداللہ، عندالرسولؐ اور عندالناس یہ مقامات عالیہ حاصل تھے اور مذکورہ بالا صفات کی بنا پر قرآن کریم کی روشنی میں قائد اعظم، مومن اعظم تھے جنہیں کانگرس کے ایجنٹ کافر اعظم کہتے نہ تھکتے تھے ۔ لیکن مولا کریم تو ہر معاملہ میں اتمام حجت کرنے کا عادی ہے ۔ یہ بات شروع سے علم الہیٰ میں تھی کہ کفار کے دوست انہیں کافر اعظم کہیں گے ۔ اس لئے حق تعالے نے اس دور کے مجدد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو عالم خواب میں حضرت قائد اعظم کو اولیاء اللہ کی صفوں میں بیٹھا ہوا دکھا دیا کہ وہ کافر اعظم نہیں بلکہ مومن اعظم ہیں ——— حضرت تھانویؒ کے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد عثمانی کا بیان ہے کہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا ———

"خواب بہت کم دیکھتا ہوں ۔ مگر آج میں نے عجیب خواب دیکھا ہے ۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے ۔ گویا کہ میدان حشر سا معلوم ہو رہا ہے اس مجمع میں اولیاء، علماء، صلحاء کرسیوں پر بیٹھے ہوتے ہیں ۔ مسٹر محمد علی جناح بھی اسی مجمع کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے ؟ تو مجھ سے کہا گیا کہ محمد علی جناح آجکل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے"

(تعمیر پاکستان و علماء ربانی صد ۱۱)

صفِ عارفین میں | قائدِ اعظم کو بعد وفات بھی اولیاء اللہ جیسا مقام ملا کہ تمام عالم اسلام میں لاکھوں مسلمانوں نے بلا تحریک و ترغیب ایصالِ ثواب کے لیے بہ تعدادِ کثیر ختم قرآن کریم کئے اور آج تک آپ کے مزار پر لوگوں کا بالکل اسی طرح تانتا بندھا رہتا ہے۔ پھول چڑھائے جاتے ہیں اور فاتحہ خوانی ہوتی رہتی ہے۔ جیسے اولیاء اللہ کے مزاروں پر ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ عنداللہ و عندالرسولؐ و عندالناس محبوب و مقبول اور عارف باللہ تھے۔

روحانی دنیا کے مطابق عارف کی تدفین ابدال کے ذمے ہوتی ہے۔ جس وقت آپ کی وفات کی خبر آپ کے روحانی مربی یعنی اس غازی مرد کو "محمدی" جہاز میں ملی۔ اس وقت وہ قائدِ اعظم ہی کے ایک مشن پر سوئے حجاز روانہ ہونے کے لئے جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ قائدِ اعظم کی وفات کی خبر ملتے ہی غازی صاحب جہاز سے اُتر کر بندرگاہ سے باہر آئے تو شہر میں مکمل ہڑتال تھی اور سواری ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی کہ اتنے میں ایک ملٹری کا ٹرک وہاں سے گزرا۔ انہوں نے اسے روکا اور جنازہ گاہ تک چلنے کی استدعا کی۔ جس نے ان کو جنازہ گاہ تک پہنچا دیا۔ اب آگے لاکھوں کا مجمع راستہ ملنا ہی دشوار تھا۔ مگر بفضلہٖ تعالیٰ راستہ خود بخود بنتا گیا۔ اور وہ ملٹری کے حلقہ تک پہنچ گئے۔ جس نے انہیں حلقہ کے اندر جانے سے روکا۔ مگر خواجہ ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے آپ کو دیکھ کر اندر بلا لیا اور ان سے فرمایا:۔

"لو بھائی! اب اپنے دوست کو خود سنبھالو"

چنانچہ انہوں نے خود ہی تن تنہا آپ کو دونوں بازوؤں پر اٹھا کر قبر میں اتارا اور راقم الحروف کو ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو مندرجہ ذیل تفصیل لکھ بھیجی:۔

"۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح کو جہاز کی روانگی تھی کہ حضرت قائدِ اعظم کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایسا اچانک صدمہ تھا کہ طبیعت قابو میں نہ رہی، سامان کو جہاز میں چھوڑا، خود نمازِ جنازہ کے لئے واپس شہر میں آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ گنہگار

دیا اور میں نے اپنے ہاتھ سے حضرت قائدِاعظم کو قبر میں اُتارا۔ ان کا وزن بمشکل ۱۵ - ۲۰ سیر ہوگا۔ جب میں نے سر کی طرف کا بند کھولا اور پیشانی پر آخری بوسہ دیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت گہری نیند سو رہا ہے۔ سکرات موت کے کوئی اثرات نہ تھے۔ قوم کا غم آخر اس بوڑھے جنرل کو قبر میں لے گیا۔ اب ہم سب کو مل کر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہیئے۔ پاکستان دشمنوں میں گھر چکا ہے حیدر آباد پر حملہ ہو چکا ہے۔ اگر لکھ سکیں تو........

آج صبح نو بجے جدہ شریف پہنچ گئے، سلطان ابن سعود کی طرف سے استقبال ہوا۔ آرام ایسا ہے جیسے اپنے گھر میں ہوتا ہے۔ یہ سب بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ زبان میں شکریہ کی طاقت نہیں۔

آپ کا بھائی ...."

(انداز سخن صدا)

مثالی کامیابی اسے قدرت کا انتظام کہیے یا انتقام کہ جس کفرستان پر بعض "ایماندار" قانع اور جہادِ پاکستان میں مانع تھے۔ اسی کفرستان میں مولا پاک نے (نعوذ باللہ) بقولے "کافرِ اعظم" کے ہاتھ سے پاکستان بنوا دیا۔ حالانکہ اسی ہندوستان میں اس سے قبل بیسیوں تحریکیں اٹھ چکی تھیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی کامیابی کی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ ان کے ناخدا "باخدا" نہ تھے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ صدق و اخلاص ؎

دل میں ہو اور عمل پر اثر انداز نہ ہو
بات ایمان کی یہ ہے بات یہ ایماں کی نہیں

۱۔ جس راستہ کو کانگرس۔ جمیعتہ العلماء ہند۔ احرار اسلام اور نیشلسٹ مسلمانوں کی تائید و امداد کے باوجود سالہا سال کی مسلسل جدوجہد کے باوجود طے نہ کر سکی۔ اسے قائدِاعظم نے بہ سرعتِ تمام بلا قید و بند طے کر لیا۔

۲۔ جس فرعون دماغ انگریز وائسرائے کے عہدِ حکومت میں قائدِ اعظم کی غیرت نے ہندوستان میں رہنا گوارا نہ کیا اور ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اُسی قائدِ اعظم نے حسنِ تدبیر سے سرزمین ہند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس عیار قوم کو باہر نکل جانے پر مجبور کردیا۔

○
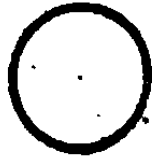
تکفین و تدفین

قائدِ اعظم کو ان کی زندگی میں جو مقامِ عظمت بخشا گیا۔ اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ مقام انہیں بعد وفات نصیب ہوا۔ قائدِ اعظم اپنے معتمدِ خاص اور روحانی مربی حضرت غازی صاحب کو جن کا ان کی روحانی تربیت میں بہت بڑا دخل تھا۔ اپنی وفات سے قبل ایک خاص مشن پر حجاز جانے کا امر فرما چکے تھے۔ وہ روانگی سے قبل مجھے ملتان مل کر گئے تھے کیونکہ میرے بھی وہ روحانی مربی، مرشد اور میں قائدِ اعظم کا پیر بھائی تھا۔ ان کی روانگی کے چند یوم بعد قائدِ اعظم کی وفات کی خبر نشر ہوئی۔ اسے سن کر مجھے سب سے زیادہ پریشانی اس بات سے ہوئی کہ آخری وقت ان کے معتمد روحانی اور مربی ان کے پاس نہ تھے کہ ان کا ایس۔ ایس محمدی جہاز سے لکھا ہوا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کا ایک خط موصول ہوا جس میں درج تھا کہ:۔

"۱۲ بجے کی صبح کو جہاز کی روانگی تھی کہ حضرت قائدِ اعظم کا انتقال ہوگیا۔ یہ ایسا اچانک صدمہ تھا کہ طبیعت قابو میں نہ رہی۔ سامان کو جہاز پر چھوڑا خود نمازِ جنازہ کی شمولیت کے لئے واپس شہر آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ کندھا دیا اور میں نے اپنے ہاتھ سے حضرت قائدِ اعظم کو قبر میں اتارا۔ ان کا وزن بمشکل ۱۵ - ۲۰ سیر ہوگا۔ جب میں نے سر کی طرف کا بند کھولا اور پیشانی پر آخری بوسہ دیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت ہی میٹھی گہری نیند سو رہا ہے سکرات موت کے کوئی اثرات نہ تھے۔ قوم کا غم آخر اس بوڑھے جرنل کو قبر میں لے گیا۔"

اس کے چند یوم بعد محترم اسد ملتانی کا ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کا گرامی نامہ ملا جس میں ان کی تکفین کا یہ حال درج تھا کہ :-

"قائدِ اعظم کی وفات کے سلسلہ میں ایک خاص بات جو غالباً اخبارات میں نہ نکلی ہو گی یہ تھی کہ ان کے لئے کوئی خاص تابوت نہیں بنوایا گیا۔ بلکہ قریب کی مسجد سے ایک عام تابوت منگایا گیا۔ اس میں معمولی کھجور کے پتوں والی چٹائی بچھائی گئی۔ کفن کے لئے بھی بالکل معمولی لٹھا ڈپو سے منگایا گیا۔ تابوت پر محض پاکستانی جھنڈا ڈالا گیا۔ اور دیگر کسی قسم کی قیمتی چادر وغیرہ نہ ڈالی گئی۔ جھنڈے کے اوپر سر کی جانب تھوڑے سے پھول رکھے ہوئے تھے۔ البتہ قبر پر پھولوں کے انبار لگ گئے روزانہ پھول ہٹائے جاتے ہیں اور نئے پھولوں کا پھر انبار لگ جاتا ہے۔ ابھی تک رات دن قران خوانی کا سلسلہ جاری ہے اور لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اس مردِ خدا نے عجیب موت پائی ہے۔"

واقعی اس مردِ مجاہد کی تکفین و تدفین کی مذکور الصدر تفصیل اخبارات میں شائع نہ ہوئی تھی۔ قائدِ اعظم کو آخری نیند سونے کی دیر تھی کہ فضائے آسمانی ختم ہائے قرآنِ پاک سے گونج اٹھی۔ پاکستان کے گوشہ گوشہ سے بالخصوص اور دنیا کے کونہ کونہ سے بالعموم بلا کسی ترغیب و ترہیب والہانہ طور پر لاتعداد ختم قرآن قائدِ اعظم کے حضور میں آخری خراجِ تحسین و عقیدت کے طور پر پہنچنے شروع ہو گئے۔ اگر کوئی بادشاہ وزیر یا امیر اجرتاً بھی اتنے ختم قرآن اس طرح حاصل کرنا چاہتا تو ہرگز نہ کر سکتا اور نہ کسی عوامی لیڈر نے ابتدائے آفرینش سے آج تک مرنے کے بعد اس قدر ختم قرآن حاصل کئے۔ قائدِ اعظم نے مر کر بھی دنیا کی تاریخ میں ایسا مقام حاصل کیا جو آج تک کسی اور لیڈر کو نصیب نہیں ہوا واقعی ؎

مرنا اس کا ہے کرے جس کا زمانہ ماتم
ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کیلئے

مدینہ منورہ سے دو خط | ابھی ختم قرآن کا سلسلہ جاری تھا کہ مجھے ماہِ نومبر ۱۹۴۸ء
میں ان کے معتمد خاص کے مدینہ منورہ سے دو خط یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ جن میں
سے ایک ۴ر نومبر کا دوسرا ۱۰ر نومبر کا تحریر شدہ تھا۔ ان میں انہوں نے اپنے مشن کی
کامیابی کی اطلاع ان الفاظ میں دی :-

"اس وقت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کے بالکل سامنے
بیٹھا مکان پر آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ یہاں کی برکات کا ذکر خط میں کیا
لکھوں۔ انشاء اللہ ملاقات پر عرض کروں گا۔ جب تک آدمی مدینہ منورہ
نہ آئے یہاں کی برکات کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ ایسی ایسی نعمتیں یہاں ملتی ہیں
کہ کائنات ان کے سامنے ہیچ ہے۔ میں جس مکان میں ٹھہرا ہوں۔ یہ سیدنا
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اس مکان میں حضورؓ شہید ہوئے تھے۔
اس مکان سے حرم محترم صرف دو گز کے فاصلہ پر ہے۔ ہر وقت گنبدِ خضرا
سامنے ہے۔ ساتھ والا مکان حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ
کا ہے۔ جب سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پاک تشریف لائے
تھے تو اسی مکان میں قیام فرمایا تھا جو کام میرے سپرد ہوا تھا۔ مولا کریم
نے اس کو پورا کیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ واپسی پر آپ سے ہی رپورٹ
مرتب کراؤں گا۔"

یہ بزرگ جب واپس ہوئے تو غریب خانہ پر بھی تشریف لائے اور دیگر کوائف
کے علاوہ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ وہ زیادہ تر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار کے
خادمِ خاص حضرت آغا اسحاق علی صاحب کے ہاں ٹھہرے تھے۔ جو زیرِ مزار مبارک آنے
جانے کے واحد مجاز ہیں۔ آغا صاحب نے بتلایا کہ جس روز پاکستان میں قائدِ اعظمؒ کا انتقال
ہوا۔ اس روز انہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ بہت مسرور
نظر آتے تھے۔ فرمایا کہ :-

"آج ہمارا دوست آرہا ہے۔ اس کی آمد کی آپ بھی خوشی مناؤ"
جب دریافت کیا کہ حضور وہ کون ہیں تو فرمایا۔
"محمد علی جناح"
ہم سب نے اس روز شیرینی وغیرہ پکائی اور وہاں سے یہ بشارت بھی لائے کہ پاکستان نہیں مٹے گا۔ اس کو مٹانے والے ضرور مٹ جائیں گے۔

بہتان طرازیاں

تحریکِ پاکستان کے دوران جہاں قائدِ اعظم کانگرس اینڈ کو سے معرکہ آرائی میں مصروف تھے۔ وہاں کانگرسی مسلمان ان کی راہ میں کانٹے بچھانے، ان کی عظمت و اہمیت گھٹانے اور عوام کو ان سے بدظن کرنے میں مشغول تھے۔ وقتاً فوقتاً قائدِ اعظم کے خلاف یہ غلط پروپاگنڈہ کیا جاتا رہا کہ:-

فاسق۔ فاجر۔ کافر

(۱)

قائدِ اعظم فاسق۔ فاجر اور کافر ہیں۔ حالانکہ وہ آئینہ قرآن میں مومنِ کامل نظر آتے ہیں۔ قائدِ اعظم نے انگلستان سے واپسی کے بعد مولانا ظفر علی خان اور سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں اپنے مسلک اور اسلام سے وابستگی کا یہ واضح بیان دیا جو کبھی کسی فاسق فاجر اور کافر سے متوقع نہیں ہو سکتا:-

"میں نے علامہ اقبال کی دعوت پر دولت اور منصب دونوں کو تج کر انڈیا میں محدود آمدنی کی دشوار گزار زندگی بسر کرنا پسند کیا تاکہ پاکستان وجود میں آئے اور اس میں اسلامی قوانین کا بول بالا ہو۔ کیونکہ دنیا کی نجات اسلامی نظام میں ہے۔ صرف اسلام ہی کے علمی و عملی اور قانونی دائروں میں آپ کو عدل۔ مساوات۔ اخوت۔ محبت۔ سکون اور امن ستیاب ہو سکتا ہے"

"میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ انڈین کانگرس حکومت بنانے کے بعد برطانوی ٹھگوں کو تو یہاں سے نکال دے گی مگر پھر ٹھگ خود بن جائے گی۔ یہ لوگ صرف مسلمانوں

ہی کی آزادی ختم نہیں کریں گے بلکہ اپنے لوگوں کی آزادی بھی ختم کردیں گے اس لئے ہم سب کو پاکستان کے قیام کے لئے زبردست کوشش کرنی چاہئے۔ ذرا خیال فرمائیے کہ اگر لا الٰہ الا اللہ پر مبنی حکومت قائم ہوجائے تو افغانستان ایران، ترکی، اردن، بحرین، کویت، حجاز، عراق، فلسطین، شام، ٹیونس، مراکش، الجزائر اور مصر کے ساتھ مل کر یہ کتنا عظیم الشان بلاک بن سکتا ہے۔
(روزنامہ ندائے ملت لاہور و ماہنامہ منارہ کراچی)

"سوشلزم کا حامی"

(۲)

ملک کے ایک کونے سے یہ آوازیں بھی آئیں کہ (خدانخواستہ) قائدِ اعظم سوشلسٹ ہیں اور وہ سوشلزم کی ترویج کے لئے پاکستان کا مطالبہ کررہے ہیں۔ مذکورہ بالا بیان میں قائدِ اعظم نے اس بہتان طرازی کی یوں قلعی کھول دی کہ:۔

"برطانیہ۔ امریکہ اور یورپ کے سارے بڑے بڑے سیاستدان مساوات کا راگ الاپتے ہیں۔ روس کا نعرہ بھی مساوات اور ہر مزدور اور کاشتکار کے لئے روٹی۔ کپڑا اور سر چھپانے کی جگہ مہیا کرنا ہے۔ مگر یورپ کے بڑے بڑے سیاستدان عیش و عشرت کی جو زندگی بسر کرتے ہیں وہ وہاں کے غریبوں کو نصیب نہیں۔ محمد علی جناح کا لباس اتنا قیمتی نہیں۔ جتنا قیمتی لباس یورپ کے بڑے بڑے لوگ اور روس کے لیڈر زیب تن کرتے ہیں نہ محمد علی جناح کی خوراک اتنی اعلیٰ ہے۔ جتنی سوشلسٹ اور کمیونسٹ لیڈروں اور یورپ کے سرمایہ داروں کی ہے۔ ہمارے پیغمبر اور خلفائے راشدینؓ نے سارا اختیار ہوتے ہوئے خود غریبانہ زندگی بسر کی مگر رعایا کو خوش اور خوشحال رکھا۔

اقبال کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ کوئی سوشلسٹ یا کمیونسٹ مسلمان نہیں ہوسکتا خواہ وہ پیر یا مولانا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ سوشلزم اور کمیونزم کے سارے بانی یہودی تھے۔ آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ سوشلزم اور کمیونزم مسلمانوں

کے لئے ایسا زہر ہے، جس کا کوئی تریاق نہیں۔ آپ کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہودی، انگریز، سوشلسٹ، کمیونسٹ اور سکھ سب مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہیں۔"
(پیپلز اکیڈمی پاکستان)

سامراجی کارندہ (۳)

قائداعظم اور مسلم لیگ کے خلاف تیسرا زہریلا پروپاگنڈا یہ کیا گیا اور اسی پروپاگنڈا کے تحت سرحد کے غیور مسلمانوں کو قائداعظم اور مسلم لیگ سے متنفر کرنے کی کوشش کی گئی کہ :۔

"مسلم لیگ سرکار پرستوں کی جماعت ہے اور وہ برطانوی سامراج کے کارندوں کا رول ادا کر رہی ہے اور قائداعظم اس کی وکالت کر رہے ہیں۔"

اس اتہام کا جواب قائداعظم نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۸ء منعقدہ پٹنہ کے صدارتی خطاب میں دیتے ہوئے فرمایا :۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ صوبہ سرحد میں ہمارے مسلمان بھائیوں اور خوش عقیدہ پٹھانوں کو جیسا کہ وہ ہیں، بتایا جاتا ہے کہ کانگریس تو لوگوں کی بھلائی چاہتی ہے جبکہ مسلم لیگ امپیریلزم کی حامی اور حلیف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس الزام سے جھوٹا کوئی الزام نہیں ہو سکتا۔ کہ مسلم لیگ امپیریلزم کی حلیف ہے۔ کیا میں نے مجلس قانون ساز کے اندر یا اس سے باہر کسی ایک موقع پر بھی امپیریلزم (برطانوی حکومت) کی پاسداری تک کی ہے؟ اس کے حلیف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں اور مسلم لیگ کا صرف ایک حلیف ہے اور وہ حلیف مسلم قوم ہے اور وہ ضرورت کے وقت، جس واحد ذات کی طرف مدد کے لئے دیکھتی ہے وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

---------- خـد ۲ ---------- کی ذات ہے"
(فاؤنڈیشن آف پاکستان جلد دوم صد ۲۰۹، از پیرزادہ شریف الدین)

(۴) اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت

کانگرس زدہ مسلمان قائدِ اعظم اور تحریک پاکستان کے خلاف یہ زہر پھیلا رہے تھے کہ قائدِ اعظم اسلام اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں نہ اس کا ان پر عمل ہے۔ اس لئے انہیں مسلمانوں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں ہے۔ حالانکہ شروع سے قائدِ اعظم کی تعلیم و تدریس میں اسلامیت کا خیال رکھا جاتا رہا۔ قائدِ اعظم کا خاندان کاٹھیاوار سے کراچی اس لئے منتقل ہوا تھا کہ وہاں اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات نمایاں تھا۔ اس لئے بغرض تعلیم قائدِ اعظم کو اسلامی تعلیمات کے مرکز سندھ کے مدرستہ الاسلام میں داخل کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں قائدِ اعظم نے از خود قرآن کریم اور اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ جس کا انکشاف انہوں نے خود اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد دکن میں کیا۔ جہاں طلباء نے آپ پر مذہب اور مذہبی تعلیمات پر سوال کیا تھا۔ قائدِ اعظم نے فرمایا:-

> "میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی پہلو ہو یا معاشی۔ غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار، نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہے۔ بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے۔ اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔"
>
> (حیات قائدِ اعظم صد ۴۲۷)

اندریں حالات قائدِ اعظم پر یہ اتہام کہ "اسلام اور تعلیمات اسلام سے ناواقف ہونے کی بناء پر قائدِ اعظم ایک اسلامی مملکت کا مطالبہ کرنے کے مجاز نہیں

سراپا غلط اور بے بنیاد تھا۔ جو حضرات کانگرس کے گیت گاتے اور مسلمانوں کو کانگرس میں شمولیت کی دعوت دیتے نہیں تھکتے تھے اور کانگرس کو مسلم مفاد کا نگران تصور کرتے تھے انکے جھوٹ کا پول کھولتے ہوئے قائداعظم نے دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ میں فرمایا:۔

"کانگرس ایک ہندو جماعت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی صداقت ہے اور کانگرسی رہنما اسے جانتے ہیں۔ چند مسلمانوں، چند غلط رہبری کئے جانے والوں اور چند ایسوں کی، جو اپنے خاص مقاصد کے تحت اس میں شامل ہیں ان کی موجودگی اسے ایک قومی ادارہ نہ بناتی ہے نہ بنا سکتی ہے۔ میں کسی بھی آدمی کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس حقیقت سے انکار کرے کہ کانگرس ایک غالب ہندو جماعت نہیں ہے۔

میں پوچھتا ہوں:۔

کیا کانگرس مسلمانوں کی نمائندہ ہے ؟

کیا کانگرس عیسائیوں کی نمائندہ ہے ؟

کیا کانگرس اچھوتوں کی نمائندہ ہے ؟

کیا کانگرس غیر برہمن ہندوؤں کی نمائندہ ہے ؟

کیا ہندو سبھا اور لبرل فیڈریشن کی موجودگی میں کانگرس تمام ہندوؤں کی نمائندہ ہے ؟"

(فاؤنڈیشن آف پاکستان جلد ۲، صـ۳۰۴)

تو ہر سوال کے جواب میں پنڈال سے نہیں نہیں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اس تجزیہ نے اس پروپاگنڈہ کا بھانڈہ سرِ راہ توڑ دیا کہ کانگرس میں مسلمانوں کا مفاد محفوظ ہے۔

گمراہ کن پروپاگنڈا تحریکِ پاکستان کے دوران اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ پاکستان

لا الٰہ الا اللہ کی بنیادوں پر استوار نہ کیا جائے گا؟ اس میں قرآنی نظام یا حکومتِ الٰہیہ قائم نہ کی جائے گی؟ کیا وہ مغرب زدہ پاکستان ہوگا۔ جس میں اسلام کے نام لیوا کشتنی و لائق گردن زدنی قرار دیئے جائیں گے؟

اسی لئے قائدِ اعظم، علامہ شبیر احمد عثمانی اور نواب زادہ لیاقت علی خان سے بار بار یہ سوال پوچھا جا رہا تھا کہ پاکستان میں کس قسم کا نظامِ حکومت ہوگا۔ یہ سوال زیادہ تر ان گوشوں سے اٹھایا گیا جو تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔ ان سوالات کا مقصد محض مسلمانوں کے دلوں میں پاکستان کے متعلق بدگمانیاں پیدا کر کے ان کو تحریکِ پاکستان سے دور رکھنے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ قائدِ اعظم کی دُور بین نظروں سے یہ محاذ بھی اوجھل نہ تھا۔ آپ وقتاً فوقتاً اپنی تقاریر اور پیغامات کے ذریعے اس پروپاگنڈے کی تردید کرتے رہتے تھے، مثلاً:۔

قائدِ اعظم کی وضاحت قائدِ اعظم نے عید الفطر نومبر ۱۹۳۹ء کے موقع پر بمبئی میں فرمایا:۔

"مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں۔ قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی"۔

ان واضح اعلانات کے باوجود بھی مخالفین پاکستان کے نظامِ حکومت کے متعلق دلوں میں وسوسہ پیدا کرنے کے لئے آپ پر برابر سوال کرتے رہے۔ جن کی بنا پر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے ۱۹۴۲ء میں آپ نے یہ واضح اعلان فرمایا کہ:۔

"مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان کا طرزِ حکومت متعین کرنے والا میں کون؟ یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کے طرزِ حکومت کا آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا تھا"۔

ایک اور موقع پر آپ نے ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں فرمایا کہ :-

"وہ کون سا رشتہ ہے۔ جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں، وہ کون سی چٹان ہے۔ جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے اور وہ کونسا لنگر ہے۔ جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔ وہ رشتہ وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن کریم ہے..... ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب۔ ایک امت!"

ایک دوسرے موقع پر ان واشگاف الفاظ میں بیان فرمایا کہ :-

"قرآن مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے۔ مذہبی، سماجی، شہری، فوجی کاروباری عدالتی، تعزیری اور قانونی ضابطۂ حیات! ——— جو مذہبی تقاریب سے لیکر جسم کی صحت تک تمام افراد سے لیکر ایک فرد کے حقوق تک، اخلاق سے لیکر جرم تک! ——— اس دنیا میں جزا وسزا سے لیکر اگلے جہان کی جزا وسزا تک حد بندی کرتا ہے"۔

(پیامِ عید ۱۹۴۵ء)

۱۱ر جولائی ۱۹۴۶ء کو حیدر آباد دکن کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ :-

"ایک مسلمان کی حیثیت سے میں علی الاعلان کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر قائم ہوں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی ایک طاقت یا کئی طاقتیں مل کر بھی مغلوب نہیں کر سکتیں"۔

قائدِ اعظم کے یہ الفاظ اس امر کی غمازی کر رہے ہیں کہ قائدِ اعظم کو اس بات کا احساس تھا کہ میں تو صرف پاکستان کا انعامِ الٰہی مسلمانوں کی خدمت میں پیش کرنے کے

لئے آیا ہوں۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ممکن ہے میں ان کے درمیان نہ رہوں تو یہ اس وقت کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ پاکستان میں وہ طرزِ حکومت رائج کریں جو قرآن حکیم نے پیش کر رکھا ہے۔

ہر کسے بہر کارے ساختند، قائداعظم کو چونکہ صرف پاکستان بنانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ لہٰذا پاکستان بننے کے فوراً بعد آپ کو واپس بلا لیا گیا کہ مسلمان اپنے حاکم حقیقی کے ساتھ کئے گئے اپنے اس وعدہ کو:۔

پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ

کہاں تک پورا کرتے ہیں یا اسے بھی دھوکا دیتے ہیں۔

زعماء لیگ کا اعلان

پاکستان کے طرزِ حکومت کے متعلق سوالات صرف قائداعظم پر ہی نہ ہوتے بلکہ وقتاً فوقتاً آپ کے رفقاء کار پر بھی ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں چونکہ مسلم لیگ کے ایک رضاکار سے لیکر قائداعظم تک سب کا نظریہ ایک تھا۔ سب کی منزل مقصود ایک تھی۔ جس کی طرف سب رواں دواں تھے۔ اس لئے اس سوال کا جواب بھی ہر جگہ ایک ہی نوعیت کا ملا اور مسلم لیگ کے کسی گوشہ سے اس رائے کے خلاف آواز نہ اٹھی۔

نواب زادہ لیاقت علی خان جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے بمقام پشاور بموجودگی ارکانِ مجلسِ عمل اعلان کیا کہ:۔

"پاکستانی علاقوں میں تمام نظام و انتظامِ حکومت قرآنِ پاک کے احکام اور اصولوں کے بموجب ہوگا"

جلسہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے نواب زادہ لیاقت علی خان نے فرمایا:۔

"اس وقت ہماری قوم کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کن اصولوں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جائے گی؟ اس سوال کا جواب مسلمان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو سال

قبل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ آپ جو پیغام الٰہی لاتے تھے۔ وہ اب ہمارے پاس موجود ہے۔ وہ دنیا کی عظیم المرتبت کتاب قرآن شریف ہے۔ جو بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے موجود ہے۔ اللہ ہی ہمارا بادشاہ ہے اور وہی ہمارا حکمران ہے۔"

"منشور" مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۴۵ء میں نواب محمد اسماعیل خان صدر مجلس عمل آل انڈیا مسلم لیگ نے علماء کرام سے مسلم لیگ کی حمایت کے لئے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"لیگ کا نصب العین پاکستان ہے اور لیگ اس پر تُلی ہوئی ہے کہ اس سرزمین میں اسلام کی اساسی بنیادوں پر شریعت مطہرہ کی حکومت قائم کرے۔"

یہی وہ اعلانات تھے، جن پر اعتماد کرتے ہوئے عوام نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور اسے عوامی تحریک کا جامہ پہنایا۔ ان اعلانات کے بعد مسلم لیگ کو جو عزت و عظمت نصیب ہوئی تھی وہ اس سے قبل کبھی اسے حاصل نہ ہو سکی تھی۔

احساسِ قائداعظم | آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے ایک اجلاس میں قائداعظم نے مخالفین، معاندین اور فاسدین کی بہتان طرازیوں اور بدزبانیوں کے سلسلہ میں فرمایا۔

"مسلمانو! میں نے دنیا کو بہت دیکھا۔ دولت۔ شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اٹھائے۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں، میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں آپ سے زور دار شہادت کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل۔ میرا اپنا ایمان۔ میرا ضمیر گواہی دے کہ جناح تم نے واقعی مدافعتِ لام کا حق ادا کر دیا۔ جناح تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا کہے کہ بے شک تم مسلمان

پیدا ہوتے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں عالم اسلام کو سر بلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔"

شاہدوں کا بیان ہے کہ جناح کے منہ سے یہ رقت آمیز الفاظ سن کر حاضرین زار زار رو رہے تھے۔ (روز نامہ انقلاب لاہور ۲۲ ر اکتوبر ۱۹۳۹ء صفحہ آخر کالم ۱)

قائدِ اعظم کا یہ ایمان افروز بیان، ان پر زبانِ طعن دراز کرنے والوں کے لئے نوشتۂ دیوار حیثیت رکھتا ہے۔

معرکہ آرائیاں

قرارداد پاکستان سے لیکر تشکیلِ پاکستان تک قائد اعظم نے تن تنہا بد طینت ہندوؤں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں، ہمعصر مسلمانوں کی محاذ آرائیوں، انگریزوں کی اسلام دشمنیوں اور ہندو نوازیوں، گاندھی کی مکاریوں، نہرو کی عیاریوں، یونینسٹوں کی غداریوں، فرقہ وارانہ خونریزیوں، خاکساروں کے حملوں، لندن کی کانفرنسوں اور انگریز وائسرائوں کی حیلہ سازیوں، شملہ کانفرنس کے فریبوں، کرپس مشن کے سرابوں، کیبنٹ مشن مشن کے ہمرنگ زمیں جالوں، ملک گیر انتخابات کی سخت ترین آزمائشوں، شہروں اور قصبوں کی خاک نوردیوں، راست اقدام اور عبوری حکومت کے مرحلوں کا جس جنون وجذبہ کے ساتھ سامنا کیا۔ اسی نے انگریزوں اور ہندوؤں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ یہ سب کچھ کن حالات میں ہوا۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حقائق سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے:۔

سیاہ وسفید سانپ قائدِ اعظم نے جب میدانِ سیاست میں قدم رکھا تو بقول مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ——— اس میدان پر سفید اور سیاہ سانپوں کا قبضہ تھا۔ سفید سانپوں (انگریزوں) کے مقابلہ میں سیاہ سانپ (ہندو) بڑے خطرناک زہریلے اور مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، یہ قائدِ اعظم کی ہمت وجرأت تھی کہ آپ نے سولہ برس سانپوں کے اندر رہ کران سے دوستی نبھائی اور انہیں مسلمانوں کا دوست اور اتحادی بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ اپنی طبعی عیاری اور مکاری کے تحت بظاہر قائدِ اعظم کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ مگر بباطن صرف قائدِ اعظم کو نہیں بلکہ پوری مسلم قوم کو ڈسنے اور

موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرتے رہے۔ قائدِاعظم نے اتنا طویل عرصہ ان کے درمیان رہ کر ان کی فطرت اور طینت کا بہت قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ کرکے یہی نتیجہ نکالا کہ انہوں نے ہندوستان کو آزادی دلانے کی آڑ میں سات کروڑ مسلمانوں کو غلام بنانے کی سازش کر رکھی ہے۔

مردہ ضمیر گروہ | جب قائدِاعظم کانگرس کو خیرباد کہکر باہر نکلے تو اس وقت مسلمانوں کی کوئی فعال نمائندہ جماعت میدانِ عمل میں موجود نہ تھی۔ مسلمان خوابِ خرگوش میں مست تھے۔ انہیں نہ سانپوں کے ڈسنے کا احساس تھا۔ نہ ان کی ملی بھگت سے کوئی خطرہ تھا۔ نہ ہی ابھی ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تھی۔ لے دے کے سرکاری کاسہ لیسیوں کی ایک جماعت بنام مسلم لیگ موجود تھی۔ جو نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ :-

"یہ روایتی کرسی پرستوں کا گروہ تھا۔ یہ اپنے منہ آپ معتبر لوگ، بمبئی والے جناح ــــــ برادری اور جاگیر سے تہی دست وکیل کی عزت افزائی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ لاٹ صاحبان کی خوشنودی کے لئے بادشاہ سلامت کی ناقابلِ تقسیم سلطنت کے گن گاتے رہتے تھے۔ ان کی کوئی نظریاتی بنیاد نہ تھی۔ ان کا وجود تھانے اور کچہری کا محتاج تھا۔ اور وہ سیاست کا ایک جھٹکا بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔" (قائدِاعظم۔ از مسٹر علوی صد ۲۳)

قائدِاعظم نے اس مردہ ضمیر گروہ کو جھنجھوڑنے، اس نیم جان جماعت میں جان ڈالنے اور مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کی بہتری کوشش کی مگر یہ سب کے سب "زمیں جُنبد نہ جُنبد گل محمد" کے مصداق بنے رہے، قائدِاعظم نے حوصلہ نہ ہارا اور گول میز کانفرنس تک ان کی خاطر سانپوں سے تنِ تنہا لڑتے رہے وہ بھی آپ کو برابر ڈستے رہے اور قائدِاعظم ان کی نیش زنی سہتے رہے۔

مایوس کن حالات | قائدِاعظم نے جب دیکھا کہ آپ کی مساعیِ اتحاد و بیداری نتیجہ خیز

ثابت نہیں ہو رہیں تو آپ نے یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے انگلستان کی راہ لی اور وہاں پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی ۔ مگر ہندوستان کے حالات سے باخبر رہتے تھے ۔

قائدِ اعظم نے ۵ ؍ فروری ۱۹۳۵ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے وطن سے اپنی ہجرت کے اسباب پر یوں روشنی ڈالی ۔

"میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے اتنا کوشاں تھا کہ ایک اخبار نے یہاں تک لکھ دیا کہ مسٹر جناح کبھی اس کام سے نہیں تھک سکتا ۔ لیکن مجھے گول میز کانفرنس میں بڑا تلخ تجربہ ہوا ۔ ہندوؤں کے خطرناک عزائم اور غیر مفاہمانہ رویہ سے مجھ میں خطرے کا ایسا احساس پیدا ہوا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش محض ایک فریب ہے ۔ میں ہندوستان کے مستقبل سے مایوس ہو گیا ۔ بدقسمتی یہ تھی کہ مسلمان لاوارث ہو چکے تھے ۔ ان کے کچھ لیڈر انگریزوں کے حاشیہ بردار تھے اور کچھ کانگریس کے خوشہ چین ! مسلمانوں کو منظم کرنے کی تمام کوششیں انگریزوں کے خیمہ برداروں اور غدار کانگریسی مسلمانوں کی وجہ سے ناکام ہو جاتی تھیں ۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ہندوستان کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا ۔ نہ بنیئے کی ذہنیت بدل سکتی ہے نہ مسلمانوں کو خطرے کا احساس ہے ۔ میں ناامید ہو کر حوصلہ ہار گیا اور لندن میں سکونت اختیار کر لی ۔ اس لئے نہیں کہ مجھے ہندوستان سے محبت نہ رہی تھی ۔ بلکہ اس لئے کہ میں بے بس ہو گیا تھا ۔ اس کے باوجود میں نے ہندوستان سے رابطہ قائم رکھا ۔ یہاں کے مسائل کا مطالعہ کرتا رہا ۔ اور سیاست دانوں سے باخبر رہا ۔"

عالمِ بیچارگی قائدِ اعظم کے لندن نشین ہو جانے کے بعد اسلامیانِ ہند عالمِ بیچارگی و بے بسی میں دن گزارنے لگے ۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے ، ان کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا تھا اور انہیں کوئی ایسا رہبر و رہنما دستیاب نہ ہو رہا تھا ۔ جو قوم کی

ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے نکال کر ساحل مراد تک لے آئے۔

اواخر ۱۹۳۰ء میں جب ہندوستان کے مردِ مجاہد مولانا محمد علی جوہر کو سٹریچر پر لاد کر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے جہاز میں سوار کرایا جا رہا تھا۔ تو بعض مخلصین نے ان سے سوال کیا کہ:-

"مسلمانوں کے پُرآشوب اور تاریک مستقبل میں، آپ کے بعد عنانِ قیادت کون سنبھالے گا؟"

آپ نے بلا تامل جواب دیا کہ:-

"صرف مسٹر جناح! ——— اللہ کرے ان کے دل میں یہ خیال سما جائے"

مولانا محمد علی جوہر کی طرح حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی نظریں بھی قائد اعظم پر لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے انہوں نے مسلم ایسوسی ایشن نیروبی (افریقہ) کے نام ایک خط میں اس بات کا ذکر ان الفاظ میں کیا:-

"میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔ مجھے اب زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہے۔ اس وقت صرف ایک شخص ایسا ہے۔ جس کی مسلمانانِ عالم کو بالعموم اور مسلمانانِ ہند کو بالخصوص اشد ضرورت ہے اور وہ ہیں محمد علی جناح! ——— میری دلی خواہش ہے کہ آپ ان کی درازیٔ عمر کے لئے دُعا کریں"۔ (نقوشِ زندگی)

صبر آزما حالات ہندوؤں میں بالعموم اور کانگرس میں بالخصوص ماہر سیاستدانوں کی کمی نہ تھی۔ کانگرس، ہندو مہا سبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ وغیرہ سب غیر مسلم تنظیمیں رام راج قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں مسلم تنظیمیں، یعنی مجلس احرار، جمعیۃ العلماء ہند، نیشنلسٹ مسلمان وغیرہ سب ہندو کانگرس کے معین و معاون تھے اور رام راجیہ کی حامی کانگرس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور مسلم لیگ ابھی تک ایک بے جان جماعت تھی۔ جس کا قائد اعظم کو گہرا احساس تھا۔ جس کا اظہار آپ نے ایک موقع پر ان الفاظ میں فرمایا:-

"ہندو دنیا کی بدترین قوم ہے۔ مگر اس کو بے مثال لیڈر حاصل ہوئے ہیں اور مسلمان اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دنیا کی بہترین قوم ہیں مگر اس کو بدترین لیڈر ملے ہیں اور ان بدترین مسلم لیڈروں کو اس بات کا اور ہندو کی مسلم دشمن ذہنیت کا اس وقت تک احساس نہیں ہوا۔ جب تک ان کی یہ دشمنی اور منافرت بدترین شقاوت کی صورت میں، پورے ملک میں نٹ راج کا ناچ نہیں دکھانے لگی"۔ (تحریکِ پاکستان صد ۳۵)

اسی احساس اور عبور مسلمانوں کے تقاضوں نے قائدِ اعظم کو انگلستان چھوڑ کر وطن واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ اپنی اس واپسی پر روشنی ڈالتے ہوئے قائدِ اعظم نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک خطاب کے دوران ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو فرمایا کہ انگلستان میں چار سال گزارنے کے بعد:۔

"میں نے دیکھا کہ مسلمانانِ ہند کی کشتی گرداب میں آ چکی ہے۔ میں نے سوچا مجھے ان کی دستگیری کرنی چاہیئے۔ میں نے ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ لندن میں بیٹھ کر میں ان کے کسی کام نہ آ سکتا تھا۔ انہیں تنظیم کی طاقت سے مسلح کرنا لازم تھا۔ طاقت کے بغیر کون کسی کی سنتا ہے۔ ورنہ میں آج تک ان کے لئے بھکاریوں کی طرح التجائیں کرتا رہا ہوں اور بھکاریوں جیسا سلوک برداشت کرتا رہا ہوں"۔

اپنوں کا عدمِ تعاون قائدِ اعظم کو خدمتِ قوم کا جذبہ کشاں کشاں انگلستان سے ہندوستان کھینچ لایا۔ مگر خفتہ بخت قوم کو جگانے کے لئے اور رابطۂ عوام کی مہم چلانے کے لئے سب سے پہلے زبان کی دقت پیش آئی۔ انگریزی کے تو آپ شعلہ نوا مقرر تھے لیکن اُردو یا علاقائی زبانوں پر آپ کو عبور حاصل نہ تھا۔ اس لئے آپ کو عوام سے براہِ راست خطاب کرنے اور انہیں آنے والے بھیانک خطرات سے آگاہ کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ ثانیاً انتخابات قریب تھے اور ان کی تیاری کے لئے وقت بہت کم تھا۔ تیسری پریشانی

یہ تھی کہ اکثریتی صوبوں کے رہنما آپ سے تعاون نہیں کر رہے تھے۔ بایں ہمہ آپ نے فوراً پارلیمانی بورڈ قائم کئے اور مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کے لئے صوبہ وار دورے شروع کر دیئے مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آپ کو پنجاب اور بنگال سے بہت توقع تھی۔ کیونکہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مگر انہی دو صوبوں نے آپ کو سب سے زیادہ مایوس کیا۔ پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس کے لئے آپ نے چالیس نمائندے مدعو کئے تھے۔ ان میں سے صرف دو ایم حسن اصفہانی اور عبدالرحمٰن صدیقی تشریف لائے۔ پنجاب سے صرف علامہ اقبال نے تعاون کیا۔ باقی سب نے انگریزوں اور ہندوؤں کے زیرِ اثر آپ سے تعاون نہ کیا۔ مگر آپ نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مشن کی کامیابی کے لئے شب و روز جدوجہد جاری رکھی۔ جس پر:-

> "رحمتِ خداوندی جوش میں آئی۔ قائد کی بات دلوں میں اتر گئی۔ اسلامیانِ ہند نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ ان کا سر ناخمیدہ، لب ناکشودہ، پیکرِ افتخار قائد ان کی خاطر بھکاری بننے کی بجائے سپہ سالاروں کی زبان میں بات کرے گا اور وہ اپنی صفیں درست کرنے لگے۔
>
> کاتبِ تقدیر نے یہ منظر اور تبارك الذی بیدہ الملك وھو علیٰ كل شیٔ قدیر پڑھ کر تاریخ کا ورق الٹ دیا۔"
>
> (قائداعظم از مسٹر علوی صد۲۴)

مخالفین کی طعن و تشنیع قائداعظم جہاں تنظیمِ مسلمین کے سلسلہ میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ وہاں کانگرس نے مسلمانوں میں نفاق و انتشار پھیلانے کے لئے رابطہ عوام کی مہم چلا رکھی تھی اور اس کے لئے بڑی بڑی عیارانہ اور فریب کارانہ چالیں چل رہے تھے۔ گاندھی صلح پسندی کا جامہ پہن کر مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر مسلم لیگ اور اربابِ لیگ کا مذاق اڑاتا کہ مسلمانوں کی اکثریت قائداعظم کے ساتھ نہیں ہے۔ مسلم لیگ الیکشن نہیں جیت سکتی وغیرہ وغیرہ اس طرح اس نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اس کے علاوہ وابستگانِ دامن بھی جادۂ وفا سے منحرف ہو رہے تھے۔ جن میں بنگال کے وزیرِ اعلیٰ

مولوی فضل حق اور پنجاب کے وزیرِ اعظم سر سکندر حیات سرِ فہرست تھے ۔

قائدِ اعظم بڑے صبر و تحمل سے ان کی لن ترانیاں سنتے رہے ۔ جب یہ لوگ اپنے گمراہ کن پروپاگنڈے سے باز نہ آئے تو قائدِ اعظم نے صرف دو باتیں لکھکر ان کے جھوٹے دعوؤں کی دھجیاں اڑا دیں ۔ آپ نے فرمایا کہ :۔

" کوئی قوم کسی مطالبے پر کبھی سو فیصدی متفق نہیں ہوتی ۔ مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہمارے ساتھ ہے ۔ اس لئے ہمیں اپنی قوم کی نمائندگی کا حق حاصل ہے "

گاندھی اینڈ کو زبان سے تو مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کا انکار کرتے تھے مگر عملاً اسے ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت سمجھ کر بار بار اس کی طرف دستِ مفاہمت بڑھاتے تھے، اسے تصفیہ کے لئے کبھی دھمکاتے تھے اور کبھی اُسے بدنام کرتے تھے ۔ اگر فی الواقعہ کوئی اور مسلم جماعت نمائندہ حیثیت کی مالک ہوتی تو گاندھی جی بار بار قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کے پاؤں کیوں پڑتے ۔ خط کیوں لکھتے ان سے بھیک کیوں مانگتے ۔

جہاں تک انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست کا معاملہ اُچھالا جا رہا تھا ۔ اس کا قائدِ اعظم نے یہ منہ توڑ جواب دیکر انہیں خاموش کر دیا کہ :۔

" الیکشن سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ۔

ایک یہ کہ کانگرس صرف ہندو انڈیا کی نمائندہ ہے ۔ صوبہ سرحد کے علاوہ چار سو مسلمان ارکان اسمبلی میں سے کانگریس کے ساتھ ایک درجن سے زیادہ افراد نہیں ہیں ۔

دوسری یہ کہ مسلم لیگ کے مقابلہ میں، مسلمانوں کی کوئی دوسری آل انڈیا جماعت نہیں ۔ اس لئے یہی جماعت مسلم انڈیا کی ترجمان ہے "

(قائدِ اعظم از مسٹر علوی صد ۲۲)

اس طرح ہندو کانگریس اور اس کے حامی مسلمان ایسے ایسے سوال اٹھا کر قائدِ اعظم کو ان میں الجھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے، تاکہ وہ اپنے اصلی مقصد حصول پاکستان کی طرف پوری توجہ نہ دے سکیں ۔ اس طرح آپ کا بہت سا قیمتی وقت ان جھوٹے اور بے بنیاد

دعوؤں کی تردید کی نذر ہو جاتا۔

غلط پریس پروپاگنڈا اندرونی اور بیرونی محاذوں کے علاوہ قائدِ اعظم کے خلاف ہندوؤں نے ایک پریس پروپاگنڈے کا محاذ کھول رکھا تھا۔ اور آئے دن ہندو پریس بلکہ انگریز پریس بھی تو بنو کی ہوائیاں چھوڑتا رہتا تھا۔ اور قائدِ اعظم، مسلم لیگ اور مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلاتا رہتا تھا۔ جس کی مجبوراً قائدِ اعظم کو اخباری ذرائع سے تردید کرنی پڑتی تھی، ان کے پروپگنڈے کی وسعت نے ژرف نگاہ بیورلی نکلس کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا کہ :-

"کانگریس کے پروپاگنڈا کا کتنا کمال ہے کہ اکنافِ عالم میں مردوں اور عورتوں کی چھوٹی بڑی لاتعداد مجلسی و معاشرتی تنظیمیں ہندوؤں کے نقطۂ نظر کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کے علاوہ دنیا میں کہیں بھی اقلیتوں کے حقوق کا سوال پیدا ہو۔" یہ نیک دل" لوگ مظلوموں کی فریاد پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ سلواک، آسٹریا، ہنگری، رومانیہ، شمالی اطالیہ، غرض دنیا میں جہاں کہیں اکثریتی طبقہ کے سلوک سے کسی اقلیت کو حقیقی یا فرضی شکایت پیدا ہو۔ یہ حساس انسان دوست، جہاں بین و جہاں گرد حضرات کمیٹیاں بنائیں گے۔ چندے اکٹھے کریں گے۔ وفود بھیجیں گے، امداد پہنچائیں گے۔ مضمون لکھیں گے۔ جلسے کریں گے، شور مچائیں گے۔ اکثریت کو مطعون کریں گے۔ مگر نہیں سنیں گے تو ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی فریاد نہیں سنیں گے۔ خواہ ان کا استحقاق کتنا بھی مجروح کیوں نہ ہو۔ ان کا مطالبۂ آزادی، ان کا شعورِ قومیت ان کے نزدیک درخورِ اعتنا ہی نہیں ہے۔"

اسی طرح ہندو کانگرس آئے دن قائدِ اعظم کی راہ میں نئی نئی رکاوٹیں کھڑی کر رہی تھی اور آپ کو مطالبۂ پاکستان ترک کرنے پر ناجائز دباؤ سے مجبور کر رہی تھی۔ تاکہ قائدِ اعظم مختلف مسائل میں الجھے رہیں اور اپنی مطلب برآری کی طرف کماحقہ توجہ نہ دے سکیں۔

خانہ جنگی کی دھمکیاں | اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی کہ پوری قوم ماسوا چند مخالفوں کے پاکستان کے مسئلہ پر متفق اور متحد ہو چکی تھی۔ اس لئے ۲۲ اپریل ۱۹۴۱ء کو وزیر ہند مسٹر ایمری نے پارلیمنٹ میں یہ بیان دیدیا کہ برطانیہ سے بار بار مطالبہ کرنے کی بجائے کانگرس اور مسلم لیگ خود کوئی ایسا متفقہ فارمولا تلاش کرلیں جس کی بناء پر ہندوستان کو دولتِ مشترکہ کا ممبر بنا دیا جائے گا ——— گاندھی نے اس کے جواب میں یہ اداکاری دکھائی کہ:۔

"یہ ہمارا خانگی معاملہ ہے۔ انگریز ہندوستان کو چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری تمام جماعتیں سمجھ جائیں گی کہ ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ جھگڑا ختم ہو جائے اور ہم دیسی طریقہ حکومت ایجاد کر لیں گے، ہو سکتا ہے کہ اس دیسی نسخے پر عمل پیرا ہونے سے پہلے ہمیں طاقت آزمائی کرنی پڑے اور اگر دونوں فریق بیرونی امداد طلب نہ کریں تو یہ خانہ جنگی دو ہفتے سے زیادہ نہیں چلے گی۔"

(قائدِ اعظم از مسٹر علوی ص ۱۱۸-۱۱۷)

اس طرح گاندھی مطالبہ پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے مسلمانانِ ہند کو دو ہفتے کے اندر ختم کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ اور اسے بروئے کار لانے اور ہندوؤں کو اشتعال دلانے کے لئے گاندھی نے ۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء کو یہاں تک لکھ دیا کہ:۔

"اگر مسلمان انڈیا کو تقسیم کرنے پر بضد ہوئے تو تقسیم ہو کر رہے گی۔ تا وقتیکہ ہندو لڑ کر اس تقسیم کو نہ روکیں۔" (بشرح صدر ص ۵۶)

خانہ جنگی یا مسلم کشی کی اہمیت جتلانے کے لئے گاندھی نے ہندوؤں کو یہاں تک بھڑکایا کہ:۔

"پاکستان کا وجود میں آجانا ایک بہت بڑا پاپ (گناہ) ہے۔ اگر ہندوؤں نے اسے نہ روکا تو اگلے جنم میں بھی اس کی سزا بھگتیں گے۔"

"قائدِ اعظم نے بارہا گاندھی جی کو شرافت سے سمجھایا کہ وہ ان اشتعال انگیزیوں سے باز رہیں۔ ہندوؤں کو خانہ جنگی اور قتل و غارت پر نہ اکسائیں۔ ایک خالص سیاسی اور آئینی مسئلہ کو شریفانہ طور پر سلجھایا جا سکتا ہے۔ اسے ہندو دھرم کی آڑ میں الجھانے اور ملک میں خانہ جنگی کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

مگر گاندھی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اس کی اشتعال انگیزیاں ہندو مسلم فساد پر منتج ہوئیں۔ ہندو گاندھی کی جے کے نعرے لگا کر مسلمانوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹتے رہے۔

مسلمانوں کا قتلِ عام | ہندوؤں نے اگست ۱۹۴۶ء میں صرف کلکتہ میں پانچ ہزار سے زائد مسلمانوں کو شہید اور اس سے کئی گنا زیادہ مسلمانوں کو زخمی کر دیا۔ کروڑوں روپے کی جائیداد تباہ کر دی گئی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی یہ آگ، کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، مدراس، سی پی، یو پی کے صوبوں تک پھیل گئی اور اس خون خرابے کے مراکز ہندو اکثریت کے علاقوں میں تھے۔ جہاں مسلمانوں کے خون سے دل کھول کر ہولی کھیلی گئی۔ صرف صوبہ بہار میں غیر جانبدار مبصروں کے اندازے کے مطابق تیس ہزار مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو شہید کر دیا گیا اور تین سو مربع میل کے علاقہ میں رہنے والے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ کانگریسی حکومت نے مسلمانوں کی حفاظت کے بجائے بلوائیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد اتر پردیش کے گڑھ مکتیشر میں مسلمانوں پر قیامت توڑی گئی۔ جہاں تین دن میں دو ہزار مسلمانوں کو شہید کیا گیا اور ان کی لاکھوں کی جائیداد تباہ و برباد کر دی گئی۔ یہی خونیں ڈرامہ دوسرے شہروں میں بھی کھیلا جاتا رہا۔ مسلمانوں کی اتنی تباہی و بربادی کے باوجود گاندھی اور پٹیل ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے سے باز نہ آئے اور الٹا دھمکاتے رہے کہ:۔

"ہم تلوار کا جواب تلوار سے دیں گے"

ان حالات نے قائدِ اعظم کی پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔

پنجاب کی بے رخی پنجاب ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن تھا۔ حکومت انگریزی اسے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اسلامی ممالک کے خلاف استعمال کرتی تھی۔ اس نے اپنے پیدا کردہ جاگیرداروں، خطاب یافتوں، اپنے پروردہ سرداروں، وڈیروں اور زمینداروں کے ذریعے اسے برطانوی سامراج کا ایک مضبوط قلعہ بنا رکھا تھا۔

پنجاب مسلمانوں کا اکثریتی صوبہ تھا۔ لاہور پنجاب کا دل کہلاتا تھا۔ مگر پنجاب کے "بڑوں" کا دل یونینسٹ پارٹی نے ہندوؤں کے پاس گروی رکھا ہوا تھا۔ جس کے سود میں انہیں کچھ مسلم حقوق عطا کئے جاتے تھے، اس لئے پنجاب کے اکثریتی صوبہ میں مسلمانوں کو صحیح معنوں میں اکثریت حاصل نہ تھی۔ ان کی قسمت کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔

قائدِاعظم انہیں ہندوؤں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑنا چاہتے تھے اور نہ وہ اس استعماری قلعہ کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ اسے فتح کر کے اس پر مسلم لیگ کا پرچم لہرانا چاہتے تھے مگر یونینسٹ لیڈر خضر حیات خان قائدِاعظم کا یوں مذاق اڑایا کرتے تھے کہ:-

"بمبئی کے خوجے مسٹر جناح کو پنجاب کے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟"

علامہ اقبال کا تقاضا قادیانوں کی طرح یونینسٹ پارٹی بھی انگریزوں کی ساختہ پرداختہ جماعت تھی۔ جس کے بل بوتے پر وہ پنجاب میں آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے حکیم الامت علامہ اقبال یونینسٹ پارٹی کو آزادی کی راہ میں سنگِ راہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار روزنامہ "انقلاب" لاہور کے مدیرانِ شہیر مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کو ایک ملاقات کے دوران کھول کر بتا دیا تھا کہ:-

"ہمارے مسائل کا حل صرف ایک ہے۔ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے مسلم لیگ جو متحدہ محاذ قائم کر رہی ہے۔ سب اسی میں شامل ہو جائیں

مسلمانوں کی زمامِ قیادت صرف لیگ کے ہاتھ میں رہے۔ ہمیں جناح سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔ صرف جناح ہی ہماری قیادت کے اہل ہیں۔"

(اقبال کے حضور صد ۲۹۴)

یہی بات علامہ اقبال نے اپنے ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء کے خط میں قائدِاعظم کو بھی لکھی کہ :-

"اس وقت شمال مغربی ہندوستان میں، بلکہ ہندوستان میں جو طوفان بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اس بھنور سے حفاظت کے ساتھ مسلمانوں کی کشتی نکالنے کا کام اگر کوئی مسلمان قائد اس وقت کر سکتا ہے تو وہ آپ کی ذات ہے اور مسلمانوں کو بحیثیت قوم اس باب میں آپ کی طرف اُمید کی نظر سے دیکھنے کا حق حاصل ہے۔"

سنگِ راہ علامہ اقبال کے اس تقاضے اور مسلم لیگ کی پنجاب میں کامیابی کے لئے قائدِاعظم نے پنجاب کی سامراجی گتھی سلجھانے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ پنجاب میں تشریف لاکر سر سکندر حیات وغیرہ سے بات چیت کی۔ مگر ان کے ارادے نیک نہ تھے اور وہ پنجاب پر مسلم لیگ کا تسلّط برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی طرف سے یونینسٹوں کو راہِ راست پر لانے کی بہتری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوتے۔

ان سے ملاقاتوں کے بعد علامہ اقبال نے قائدِاعظم کو یونینسٹوں کے مندرجہ ذیل ارادوں سے اپنے مکتوب مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۷ء کے ذریعہ آگاہ کر دیا۔ تاکہ آپ پر موانعات و مشکلات روزِ روشن کی طرح واضح رہیں :-

۱۔ سر سکندر حیات خان اس سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوں گے کہ لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ کا مکمل اختیار انہیں دیدیا جائے۔

۲۔ وہ چاہتے ہیں کہ لیگ کا سیکرٹری، جس نے لیگ کے لئے اتنا کچھ کیا ہے اور لیگ کے دیگر عہدیدار ہٹا دیئے جائیں۔

۳۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ لیگ کے روپے پیسے کے معاملات پر بھی ان کے آدمیوں

کا اختیار ہو۔

۴۔ میرے خیال میں تو وہ اس طرح لیگ پر قبضہ جما کر آخر میں اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔

۵۔ یونینسٹ حضرات کی عیاریاں لیگ کو اور بھی نقصان پہنچائیں گی۔

اس لئے علی گڑھ کے بعد قائدِ اعظم نے اپنی سرگرمیوں کا دوسرا مرکز پنجاب کو بنا لیا اور انہوں نے برطانیہ کے خود ساختہ و پرداختہ جاگیرداروں وغیرہ کو کھلم کھلا ہتھیار ڈالنے کے لئے چیلنج دیا اور طلبار کا لاؤ لشکر ان سرکاری ایجنٹوں کے خلاف میدانِ عمل میں نکل آیا۔ جس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ یونینسٹ وزارت ٹوٹ گئی اور قائدِ اعظم برطانوی سامراج کے اس مضبوط ترین قلعہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح پنجاب بھی قائدِ اعظم کے لئے سب سے بڑا سنگِ راہ بنا رہا اور آپ جو مکھی لڑتے رہے۔

دشمنوں کے آلہ کار

علاوہ ازیں قائدِ اعظم کو اس بات کا بھی بڑا افسوس تھا کہ ہندو تو کبھی مسلمانوں کی خیر خواہی کا تصور بھی نہیں کر سکتے، مگر مسلمان ان کے دست و بازو بن جاتے ہیں جسے آپ نے مسلمانوں کی بدنصیبی سے تعبیر کرتے ہوتے فرمایا:۔

"مسلمان قوم کی ایک بہت بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں کو خود ہم ہی میں سے ایسے لوگ مل جاتے ہیں۔ جو آسانی سے ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔" (نقوشِ قائدِ اعظم صد۲۶)

تیسری پریشان کن بات یہ تھی کہ جب بھی کوئی کانفرنس ہوتی یا کمیشن یا مشن کے روبرو ہلی۔ امورِ زیرِ بحث آتے تو ہندوؤں کی طرف سے وکالت کرنے کے لئے کئی جماعتیں میدان میں نکل آتیں، مگر قائدِ اعظم کو تنِ تنہا سب سے نبٹنا پڑتا۔

۱۹۲۲ء میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے ڈاکٹر انصاری اور لالہ لاجپت رائے نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ جس میں بنگال کے مشہور لیڈر چترنجن داس نے اپنی طرف سے کچھ منصفانہ تجاویز کا اضافہ کیا۔ ہندوؤں نے داس کی تجاویز یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ ان میں مسلمانوں کو ان کے حق سے زیادہ دیا گیا ہے۔ اس سمجھوتہ کے نہ ہونے کی ایک وجہ قائدِ اعظم نے یہ بتلائی کہ:۔

"ہندوؤں کی طرف سے بولنے والی تو کئی جماعتیں تھیں ۔ مثلاً کانگرس سوراج پارٹی، لبرل پارٹی اور ہندو سبھا ۔ مگر مسلمانوں کی طرف سے کوئی باا ثر جماعت موجود نہ تھی ۔" (ہمارے قائدِ اعظم صد۲۴)

یہ وہ حالات تھے جن میں قائدِ اعظم توکلاً علی اللہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے برسرِ پیکار رہے ۔ اگر ہندوؤں کی طرح ان کی پشت پناہی کے لئے بھی مسلمان جماعتیں موجود ہوتیں اور وہ ہندوؤں کا آلۂ کار نہ بنتیں تو پاکستان بہت پہلے بن چکا ہوتا ۔

مارِ آستین قائدِ اعظم کے لئے مزید ایک سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ بعض لوگ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن بن کر وطن دشمنی اور مسلم فروشی کے مذموم کارو بار میں لگے ہوئے تھے، اس بات کا سراغ ان دنوں چلا جب ۱۹۴۲ء میں سر سٹیفورڈ کرپس کے ہندوستانی مشن کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس بند کمروں میں ہوتے اور اندرونِ خانہ کی بحث و تمحیص کی رپورٹ دوسرے روز ہندو اخبارات کی زینت بن جاتی ۔ جس سے سب کو پریشانی اور ایک دوسرے پر بدگمانی ہونے لگی ۔ کیونکہ اس حرکت سے کانگریس مہاسبھا اور سکھوں کو سر سٹیفورڈ کے سامنے اپنا موقف پیش کرنے میں بڑی مدد مل رہی تھی اور وہ مسلم لیگ کے اعتراضات کا جواب گھر سے تیار کر کے لے آتے اور ہر اعتراض کا جواب فوراً پیش کر دیتے ۔ جس کی وجہ سے مسلم مفاد کو نقصان پہنچتا اور قائدِ اعظم کو بڑی دشواری پیش آتی ۔

آخر کار مجلسِ عاملہ میں یہ صورتِ حال پیش کی گئی اور قائدِ اعظم نے بڑے دُکھ کے ساتھ مجلسِ عاملہ کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے ان مخبر اور جاسوس حضرات سے فرمایا کہ :-

"وہ یہ یاد رکھیں کہ اپنے اعتماد کے بلند مرتبے کی بنا پر، ان پر قوم کا ایک فرض عائد ہوتا ہے ۔ انہیں دوسروں کو خبریں پہنچا کر اس اعتماد سے غداری نہ کرنا چاہئیے ۔ کیونکہ اس سے ہماری قوم کو بے پناہ نقصان پہنچے گا اور اسی حساب سے ہمارے دشمنوں کو فائدہ !" (قائدِ اعظم میری نظر میں صد۲۵)

لیکن اس شریفانہ تنبیہ کے باوجود وہ حضرات اس حرکت سے باز نہ آئے خفیہ اجلاسوں تک کی خبریں ہندو اخبارات کو پہنچاتے رہے جو ان میں باقاعدہ چھپتی رہیں جس پر ہر ممکن ذرائع سے ان قومی غداروں کا پتہ لگا لیا گیا۔ قائدِ اعظم نے انہیں مجلسِ عام میں بے نقاب اور شرمسار کرنے کی بجائے اس موقعہ پر بھی بڑے حوصلہ اور تحمل سے کام لیا اور ان کو مجلسِ عاملہ کے آئندہ اجلاس کا نہ ایجنڈا بھیجا اور نہ دعوت نامہ۔ بدقسمتی سے یہ مارِ آستین مسلم لیگ کے ایک دیرینہ وفاشعار اور معتمد نکلے جن سے قائدِ اعظم کو بڑا اُنس تھا۔

پریشان کن حالات قائدِ اعظم کے مخلصین میں بعض ایسے کم فہم اور کم حوصلہ حضرات بھی تھے جو آپ کے لیے پریشانی کا موجب تھے اور خواہی نخواہی آپ کے سکون و اطمینان میں مخل ہوتے رہتے تھے۔ حالانکہ اعتماد کا تقاضا یہ تھا کہ آنکھیں بند کر کے آپ کی پیروی کی جاتی۔ سر عبدالقادر کی روایت کے مطابق :۔

"دہلی میں مرکزی اسمبلی کے جلسے ہو رہے تھے، سر محمد یعقوب مرحوم نے جو اسمبلی کے نائب صدر تھے۔ جناب محمد علی جناح کے اعزاز میں چند دوستوں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ میں بھی اتفاق سے اس زمانہ میں وہاں موجود تھا لہٰذا مجھے بھی انہوں نے یاد فرمایا۔ وہاں اثنائے گفتگو میں جناب محمد علی جناح نے قدرے دکھی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کر کے فرمایا :۔

"سیاسیات کی چالیں، شطرنج کی چالوں سے بہت ملتی جلتی ہیں میری قوم نے ایک طرف تو یہ کام میرے سپرد کیا ہے کہ میں ان کی جانب سے بطور ایک سیاسی شاطر کے بساطِ شطرنج بچھاؤں اور چالیں چلوں اور دوسری طرف میری قوم اصرار کرتی ہے کہ میں ساتھ ہی یہ بھی بتاتا جاؤں کہ یہ چال کیوں چلی ہے؟ تمہیں بتاؤ! یہ کھیل اس طرح کھیلا جا سکتا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں" ——— اس پر انہوں نے فرمایا :۔

"قوم سے کہہ دیجئے کہ اگر انہیں اپنے شاطر پر بھروسہ ہے تو مجھے

چال چلنے دیں اور مجھ سے ہر چال کا سبب نہ پوچھیں کہ کیوں ؟ ورنہ کوئی اور شاطر ڈھونڈ لیں۔" (نقوشِ قائدِ اعظم صلا)

بیزار کن واقعات مسلمان طبعاً پرجوش واقع ہوئے ہیں۔ جب جوش میں آتے ہیں تو پھر ہوش سے قطعاً کام نہیں لیتے بلکہ ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں جو بسا اوقات سخت مضر بلکہ مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل جب غیر مسلم بربریت اور سفاکیت کا ننگا ناچ ناچنے لگے اور مسلمانوں کو نشانۂ ظلم و ستم بنانے لگے تو کچھ لوگوں نے قائدِ اعظم کے سامنے یہ مدافعانہ تجویز رکھی کہ مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں کی طرح اسلحہ سے مسلح ہونا چاہئے اور آپ کو اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔ بقول ممتاز حسن مرحوم۔ قائدِ اعظم نے برہم ہو کر فرمایا:۔

"کیا تم لوگ مجھے منافق سمجھتے ہو کہ ایک طرف تو صلح کی اپیل پر دستخط کروں اور دوسری طرف تمہارے لئے ہتھیاروں کا بندوبست کروں! میں ہرگز ہرگز کسی ایسی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو، خواہ غیر مسلموں کی طرف سے۔" (ماہنامہ "ماہِ نو" کراچی دسمبر ۱۹۵۴ء)

کھوٹے سکّے پاکستان بننے کے بعد جب مسلمانوں نے اللہ جل شانہٗ سے کیا ہوا یہ وعدہ پسِ پشت ڈال دیا کہ :۔

پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ

اور رہبروں تک راہزنی پر اتر آئے۔ ہوس پرستی اور خود غرضی کو اپنا شعار اور خدا کی بجائے اقتدار کو اپنا معبود بنا لیا تو قائدِ اعظم کو اس بات کا سخت صدمہ ہوا اور آپ نے حسبِ عادت لگی لپٹی رکھے بغیر بھری مجلس میں ان رہنماؤں کے منہ پر فرما دیا کہ :۔

"جب میں اپنا ہاتھ دائیں جیب میں ڈالتا ہوں تو کھوٹا سکہ ہاتھ لگتا ہے اور اپنا بایاں ہاتھ جیب میں ڈالتا ہوں تو بھی کھوٹا سکہ نکلتا ہے۔"

(ہفت روزہ "زندگی" لاہور ۱۷ جون ۱۹۷۳ء)

ایک اور موقعہ پر تو آپ کو یہاں تک کہتے سنا گیا کہ :-

" اگر مجھے پتہ ہوتا کہ قوم بالکل کرپٹ ہو چکی ہے تو میں پاکستان کا مطالبہ ہی نہ کرتا "

یہ وہ صبر آزما حالات تھے، جن کا تعمیرِ پاکستان کے دوران قائدِاعظم کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا۔ اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے پنجۂ استبداد سے بچایا۔ یہ قائدِاعظم کی ہمت تھی کہ انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور بڑے صبر و استقلال سے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے چلے گئے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ یا بک گیا ہوتا یا میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہوتا۔ مگر جُوں جُوں وقت گزرتا گیا۔ قائدِاعظم کا مذکورہ بالا ارشاد متشکل ہو کر سامنے آتا گیا۔ قوم نے کرپشن کو ایک قومی پالیسی بنا کر ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے پاکستان کو پاک نہ رہنے دیا گیا۔ اور اس ناپاک پالیسی کی بدولت ہم سے نصف حصہ چھن گیا۔

تائیدِ ایزدی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب تک تائیدِ ایزدی حاصل نہ ہو انسان کامیابی و کامرانی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا اور جب حق تعالےٰ کسی سے خدمتِ دین لینا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے دین و دانش بخشتا ہے۔ پھر فہم و فراست سے مالا مال کرتا ہے۔ اس کی نظر میں وسعت، اس کے قلب میں خشیّت اس کے نطق میں اثر و تاثیر اور عوام و خواص میں اس کے لئے محبت۔ عزت۔ عظمت اور مقبولیت پیدا کر دیتا ہے۔ دشمنوں کے دلوں میں اس کی ہیبت بٹھا دیتا ہے۔ حاسدین۔ معاندین اور ناقدین کے حوصلے پست کر دیتا ہے۔ غرض کہ بقول علامہ اقبالؒ ع

فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ایک اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالنے اور اس میں نظامِ دین رائج کرنے کے لئے مغرب زدہ طبقہ سے جب قائدِاعظم کو منتخب کیا گیا تو ان میں مذکورہ بالا تمام خصوصیات پیدا کر دی گئیں۔ ان کی مدد سے انہوں نے لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر اس خوبی سے ایک دینی تحریک، سیاسی رنگ میں چلائی کہ جن کو دین سے دور کا بھی واسطہ نہ

تھا یا جو نماء ربانی فتنوں کے ڈر سے حجروں اور خانقاہوں میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ سب کے سب قائدِ اعظم کی پشت پناہی کے لئے لا الہ الا اللہ کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے اور انہوں نے دشمنانِ اسلام یعنی انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ بے تیغ و تفنگ حصولِ پاکستان کے لئے ایک ایسی جنگ لڑی کہ جس کی دشمن بھی داد دینے پر مجبور ہو گیا۔ گاندھی اینڈ کو کے اخبار "ہندوستان ٹائمز" نے لکھا۔

"قائدِ اعظم کے عزم بالجزم کے سامنے حقائق مٹ گئے اور خواب و خیال حقیقت کی شکل میں مجسم ہو کر دنیا کے سامنے آ گئے۔ انہوں نے اپنے زمانہ کی عظیم شخصیت (گاندھی) کو للکارا اور بازی جیتی جو ان کے ارادہ کی پختگی اور خلوصِ نیت کا نتیجہ ہے"۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے بیسیوں تحریکیں چلائیں مگر ان کے رہنماؤں کو چونکہ تائیدِ ایزدی حاصل نہ تھی۔ اس لئے کوئی تحریک بھی عروسِ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی اور نہ کسی عوامی لیڈر کو قائدِ اعظم جیسا مقام نصیب ہوا۔ تحریکِ پاکستان چونکہ خالص دینی بنیاد لا الہ الا اللہ پر چلائی گئی۔ جس کا مقصد نظامِ دین رائج کرنے کیلئے ایک اسلامی سلطنت کا قیام تھا اور اس کا قائد دینِ اسلام کی سربلندی چاہتا تھا۔ اس لئے اسے اعانتِ ایزدی حاصل رہی کیونکہ ارشادِ ربانی ہے۔ وَلَیَنصُرَنَّ اللّٰہُ مَن یَنصُرُہٗ کہ جو بھی فرد، جماعت یا حکومت دین کی امداد کرے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہو جائے۔ اس کی فتح و کامیابی یقینی ہوتی ہے۔

دین و سیاست | مقامِ افسوس ہے کہ قائدِ اعظم کے کسی سوانح نگار نے ان کی زندگی کے مذہبی پہلو پر تحقیق کرنے یا اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور جنہیں ان باتوں کا علم تھا یا جن کے علم میں یہ باتیں لائی گئیں۔ انہوں نے بھی ان سے اغماض برتا اور انہیں صیغۂ راز میں رہنے دیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک دین کی اتنی اہمیت نہ تھی جتنی سیاست کی تھی۔ اسی لئے ہر کس و ناکس یہی کہتا نظر آیا کہ قائدِ اعظم کی سیاست نے پاکستان بنا

دیا۔ حالانکہ انکی ساری سیاست دین کے تابع تھی اور پاکستان محض ان کی دینی تربیت بصیرت اور دینی تحریک کی بنا پر انہیں احکم الحاکمین کی طرف سے بطور انعام عطا ہوا تھا۔ جس کا اعتراف خود قائد اعظم نے ان الفاظ میں کیا:۔

"کیا کسی قوم پر اس سے بڑھکر (خدا کا) کوئی انعام ہو سکتا ہے؟ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے رسول اکرمؐ سے کیا تھا کہ اگر تیری امت نے صراط مستقیم کو اپنے لئے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اس انعام عظیم کی حفاظت ہر پاکستانی مرد و زن۔ بچے۔ بوڑھے اور جوان پر فرض ہے۔" (آخری لمحات)

حرفِ آخر

گذشتہ صفحات میں قائدِاعظمؒ کی دینی تربیت کے بارے میں آپ بالتفصیل پڑھ چکے ہیں کہ وہ مجدد الملت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہوئی۔ طاہر لاہوری لکھتے ہیں :-

" حضرت قائدِاعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اب تک سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر پہلو روشن تھا۔ ذہانت و فراست کی روشنی بچپن سے آخری سانس تک آپ کے ہر ہر لفظ سے مترشح تھی۔ یہ ان کی ذہانت و فراست، تدبر، خلوص، دیانت، ہمت، جرأت اور سچا مسلمان ہونے کا ثمر ہے کہ ہم آج اقوامِ عالم میں ایک باعزت قوم کی حیثیت سے ایک باوقار ملک پاکستان میں آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قائدِاعظم نے کبھی اپنے آپ کو کسی فرقہ سے وابستہ نہیں کیا۔ انہوں نے جب کہا اپنے آپ کو صرف مسلمان کہا اور یہی ایک سچے مسلمان کی علامت ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قائدِاعظم کے متعلق اس سلسلے میں جو تجزیہ کیا یا اظہار کیا وہ بھی حقیقت پر مبنی ہے، ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ چند روز کے لئے مفتی محمد حسن کے ہاں ٹھہرے۔ حضرت تھانویؒ ان کے پیر و مرشد تھے۔ مفتی محمد حسن مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور بھی رہ چکے تھے اور اس وقت وہ اپنی رہائش گاہ واقع شریف پورہ امرتسر (بھارت) میں مقیم تھے اور اپنے پیر و مرشد کے سامنے باادب بیٹھے تھے۔ جب حضرت

تھانویؒ وہاں تشریف لاتے تو امرتسر کے دیگر اکابر بھی ان سے ملنے کے لئے مفتی محمد حسن صاحب کی رہائش گاہ پر موجود تھے۔ اس محفل میں سیاسی گفتگو جاری تھی۔ موضوعِ گفتگو خاص طور سے کانگرس، مسلم لیگ اور قائدِ اعظم محمد علی جناح تھا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے شاگردِ سعید مفتی محمد حسن سے فرمایا:-

"محمد حسن! مجھ سے اکثر مجالس میں آج کل کانگریس اور مسلم لیگ کے سلسلے میں سوالات کئے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ محمد علی جناحؒ کی شخصیت پر بھی مجھ سے استفسار کرتے ہیں۔ میں ان کے متعلق تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ محمد علی جناح کے ہاتھ میں مسلم لیگ کی قیادت ہے۔ مسلمانانِ ہند میں سیاسی اعتبار سے آپ قابل ترین شخصیت ہیں۔ اس بات کو مخالفین بھی مانتے ہیں کہ محمد علی جناحؒ سرکاری آدمی نہیں۔ مسلمانانِ ہند کی آزادی کے لئے ان کے دل میں بے پناہ تڑپ ہے۔ ان کا ولولہ اور جذبہ انتہائی مخلصانہ ہے۔ اس لئے برطانوی حکومت اور کانگریس کے مقابلے میں انہوں نے ہمیشہ مسلمانانِ ہند کی بہتری کے لئے آواز بلند کی ہے۔ جناح صاحب کے متعلق کئی کم فہم مسلمان یہ پروپاگنڈہ کر رہے ہیں کہ وہ جاہ و حشم حاصل کرنے کے لئے سب دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ ایسا پروپاگنڈہ کرنے والوں کو شرم آنی چاہیئے۔ اگر محمد علی جناح جاہ و منصب کے متمنی ہوتے تو کسی خطاب یا عہدے کے لئے کوشش کرتے کیونکہ یہ چیزیں ایسی قابل شخصیت کے لئے حاصل کرنا انتہائی آسان ہیں لیکن وہ کبھی اس کی خواہش نہیں کرتے۔ وہ مخلص اور دیانتدار مسلمان ہیں اور مسلمانانِ ہند کے قابل ترین رہنما ہیں۔ ان کی دیانتداری اور اخلاص کی روشنی بتا رہی ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ اللہ جلّ شانہ، مسلمانوں کے لئے علیحدہ ریاست کا سہرا انشاء اللہ محمد علی جناح کے سر باندھیں گے۔

میں نے اپنے تمام متعلقین اور مریدین کو کہہ دیا ہے کہ وہ ہر حالت میں اور ہر بات میں محمد علی جناحؒ کا ساتھ دیں ۔"

مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے ان الفاظ کی روشنی میں حضرت قائدِ اعظمؒ کی شخصیت اور قدآور ہو کر اس لئے سامنے آتی ہے کہ شاہِ اشرف علی تھانویؒ خود صاحبِ کشف بزرگ تھے ۔ قرآن و حدیث کے بہت بڑے عالم تھے ۔ اسلام کی جو روشنی انہوں نے برِصغیر میں پھیلائی وہ قیامت تک ماند نہیں پڑے گی ۔ ایسے باعمل بزرگ کی زبان سے نکلی ہوئی بات ، خطا نہیں جا سکتی ۔ بعد میں حالات نے ان کے تاثرات کو حرف بہ حرف سچ ثابت کیا ۔" (امروز ۲۵ ر اگست ۱۹۸۵ء)

۴ ر جولائی ۱۹۴۳ء کو مولانا اشرف علی تھانوی نے شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو بلایا اور کہا ، ۔

"مجھے کشف سے معلوم ہوا ہے کہ محمد علی جناح کو ربِ قدیر کامیابی دیں گے ۔ ۱۹۴۱ء کی قراردادِ پاکستان کو کامیابی نصیب ہو گی ۔ میرا وقت آخری ہے ۔ اگر میں زندہ رہتا تو ضرور کام کرتا ۔ مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ خطہ بنے ۔ قیامِ پاکستان کے لئے جو کچھ ہو سکے کرنا اپنے مریدوں کو بھی کام کرنے پر ابھارنا ۔ تم دونوں عثمانیوں میں سے ایک میرا جنازہ پڑھائے گا اور دوسرا عثمانی قائدِ اعظم کا جنازہ پڑھائے گا ۔" (ایضاً)

مولانا کی یہ بات حرف بحرف درست نکلی ۔ آپ کا جنازہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے پڑھایا اور قائدِ اعظم کا جنازہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھایا ۔ مولانا شبیر احمد نے آپ کے جنازے پر تقریر کی اور کہا ۔ میں نے بڑے بڑے اولیاء اللہ اور علماء کی صحبت اٹھائی لیکن جیسا ایمان باللہ میں نے اس شخص میں دیکھا ہے ویسا کسی میں نہ پایا ۔

کارزارِ حیات

قائدِ اعظمؒ

چھ ماہ	عدلیہ کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔
ایک سال	مختلف بیرونی سفروں میں گزارا۔
دو سال	میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔
تین سال	بیروزگاری کا شکار رہے۔
بارہ سال	انگلستان میں قیام رہا۔
بارہ سال	ازدواجی زندگی گزاری۔
سولہ سال	کانگرس سے وابستہ رہے۔
اکتیس ۳۱ سال	مسلم لیگ کی قیادت کی۔
چوالیس ۴۴ سال	وکالت کرتے رہے۔
ایک سال ۲۷ یوم	گورنر جنرل پاکستان کے عہدہ پر فائز رہے۔

بالآخر

۷۱ سال ۸ ماہ اور ۱۶ یوم اس دارِ فانی میں گزار کر دارالبقاء کو سدھار گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

کتابیات

۱ - جناح — مسٹر بولیتھو
۲ - ہمارے قائدِ اعظم — اعجاز احمد
۳ تقسیمِ عظمیٰ — مسٹر ہڈسن
۴ - سرگزشت — سر آغا خان
۵ - بے تیغ سپاہی — نواب صدیق علی خان
۶ - اندازِ سخن — منشی عبدالرحمٰن خان
۷ - ظہورِ پاکستان — چوہدری محمد علی
۸ - جامع المجددین — مولانا سید سلیمان ندوی
۹ - خطبۂ صدارت — علامہ اقبال
۱۰ - نقوش و تاثرات — مولانا عبدالماجد دریابادی
۱۱ - آثارِ رحمت — مولانا اشرف علی تھانوی
۱۲ - نقوشِ قائدِ اعظم — رحیم بخش شاہین
۱۳ - خطباتِ قائدِ اعظم — مولانا رئیس احمد جعفری
۱۴ - روئیدادِ تبلیغ — مولانا شبیر علی تھانوی
۱۵ - مشاہدات و واردات — منشی عبدالرحمٰن خان
۱۶ - افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ اتنہ — مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان
۱۷ - جامِ جمشید — مولانا اشرف علی تھانوی
۱۸ - یادِ رفتگان — علامہ سید سلیمان ندوی
۱۹ - آئینۂ حقیقت نما — مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی
۲۰ - حیاتِ قائدِ اعظم — سردار محمد خان
۲۱ - مشن وِد مونٹ بیٹن — ایلن کیمبل جانسن
۲۲ - آخری لمحات — ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش
۲۳ - تعمیرِ پاکستان و علمائے ربانی — منشی عبدالرحمٰن خان
۲۴ - عظمتِ رفتہ — ضیاء الدین احمد
۲۵ - قائدِ اعظم اور انکا عہد — رئیس احمد جعفری
۲۶ - قائدِ اعظم محمد علی جناح — چوہدری رحمت علی علوی
۲۷ - قائدِ اعظم میری نظر میں — ایم - ایچ - اصفہانی
۲۸ - سیرتِ اشرف (تھانوی) — منشی عبدالرحمٰن خان
۲۹ - قائدِ اعظم جناح — جی - الانا
۳۰ - ایمبیسیڈر آف ہندو مسلم یونٹی — سروجنی نائیڈو
۳۱ - مسٹر مانٹیگوز ڈائری — وزیر ہند مسٹر مانٹیگو
۳۲ - معمارانِ پاکستان — منشی عبدالرحمٰن خان
۳۳ - تحریکِ پاکستان — شمیم احمد جامعہ
۳۴ - کردار قائدِ اعظم — منشی عبدالرحمٰن خان
۳۵ - اقبالؒ کے حضور — نذیر نیازی
۳۶ - قائدِ اعظم کی کامیابی کا راز — منشی عبدالرحمٰن خان
۳۷ - خوجوں کی تاریخ — سچے دینا
۳۸ - میرا بھائی — فاطمہ جناح
۳۹ - فائنل فیز آف سٹرگل فار پاکستان
۴۰ - فاؤنڈیشن آف پاکستان

جرائد

سٹیٹسمین دہلی — اپریل ۱۹۱۸ء

ماہِ نو کراچی — دسمبر ۱۹۵۴ء

ہفت روزہ زندگی لاہور — جون ۱۹۷۳ء

صدقِ جدید لکھنؤ — جنوری ۱۹۴۶ء

روزنامہ جنگ کراچی — اگست ۱۹۷۶ء

سیارہ ڈائجسٹ لاہور — دسمبر ۱۹۷۴ء

اُردو ڈائجسٹ لاہور — اگست۔ ستمبر ۱۹۷۶ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور — ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۶ء

ہفت روزہ خدام الدین لاہور — ۱۹۸۵ء

روزنامہ انقلاب لاہور و روزنامہ انقلاب بمبئی۔

ندائے ملّت لاہور، ماہنامہ فاران کراچی۔

لندن ٹائمز

مفتی عبدالرحمٰن خان کی معلومات افزا قابل دید کتابیں

★ <u>نئے فتنے</u>: دنیا میں افتراق و اختلاف اور تباہی و بربادی پھیلانے والے فتنوں مثلاً اشتراکیت ایٹمی شیطان کا عملی کھونی سیلاب میکس ویبر نفسیاتی بم سرخ سرطان اسرائیلی بربریت جنسی آزادی مغربی تہذیب اشتراکی دنیا کمیونسٹ ثقافت وغیرہ کا حیران کن جائزہ حجم ۲۳۶ صفحات قیمت ۳۰/- روپے

★ <u>افسر شاہی</u>: اپنی نوعیت کی پہلی کتاب جس میں افسر شاہی کی خود غرضی حکمرانی من مانی بدعنوانی ہٹ دھرمی اور اندھیر گردی کے شاہکار حقائق کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں دیباچہ از شیخ انوار الحق چیف جسٹس پاکستان حجم ۳۱۶ صفحات قیمت ۴۰/- روپے

★ <u>پاکستان کی قیمت</u>: جو بنفس نفیس ۱۸ لاکھ مسلمانوں کے قتل ایک لاکھ عورتوں کے اغوا قریباً ۸۰ لاکھ مسلمانوں کو ان کی جائداد سے محروم کرنے کے بعد کروڑوں انسانوں نے ادا کی ... مسلمانان ہند پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ کر وصول کر رہے ہیں مستند سرکاری اور غیر سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں دل دہلا دینے والی کتاب ضخامت ۳۰۰ صفحات قیمت ۳۶/- روپے

★ <u>کتابِ زندگی</u>: فاضل مصنف نے اس کتاب میں ایسے عبرت آموز اور حقائق افروز مشاہدات تجربات اور معلومات جمع کر دی ہیں جن کا کسی اور جگہ ملنا محال ہے نیز اس میں ایسے معاشرتی ثقافتی سماجی سیاسی علمی مذہبی تاریخی اور روحانی حقائق جمع کر دیئے ہیں جو آنے والے مؤرخ کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں ضخامت ۶۰۰ قیمت ۴۵/- روپے

★ <u>خزینۂ بصیرت</u>: یہ سیٹ پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے ۱۔ خدا کہاں ہے ۲۔ قرآن اور سائنس ۳۔ اسلام اور سائنس ۴۔ مذہب اور سائنس ۵۔ اسلام اور انسان ۶۔ اسلام کے بنیادی ستون ۷۔ عہد نبوی کی برکات ۸۔ اسلام اور اخلاق ۹۔ اسلام کا نظام تعلیم ۱۰۔ اسلام کا معاشرتی نظام ۱۱۔ اسلام کا نظام عدل و انصاف ۱۲۔ اسلام اور مغربی تحریکات ۱۳۔ اسلام کیسے پھیلا ۱۴۔ مقام شہادت اور قیام قیامت ۱۵۔ پندرہویں صدی کے تقاضے ہر جلد کی ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحات قیمت فی جلد ۲۲/- روپے

★ <u>پرویزی اسلام</u>: مارکسیت اشتراکیت لادینیت کے شعبہ اسلامیات کے نقیب ادارہ طلوع اسلام کی تحریک انکار حدیث کے سلسلہ میں ڈاکٹر ایس اے رحمان چیف جسٹس آف پاکستان اور مفتی عبدالرحمٰن خان کی مناظرانہ مکاتبت جس سے جسٹس صاحب پر پرویزی تحریک کا اثر ثابت ہوا قیمت ۵/- روپے

★ <u>بازارِ رشوت</u>: اسلام کے نام پر قائم ہونے والے پاکستان میں رشوت ستانی نے جو حیثیت اختیار کر لی ہے زندگی کا کوئی شعبہ اس سے بچا نہیں اس کتاب میں قرآن و حدیث کی روشنی میں رشوت کے بھیانک نتائج پیش کیے گئے ہیں قیمت ۱۲/- روپے

عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ چہلیک ملتان فون ۲۱۶۷۵